وحید احمد کی ناول نگاری میں تہذیبی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ

("زینو" اور "مندری والا" کے حوالے سے)

مقالہ برائے ایم۔ فل (اُردو)

مقالہ نگار

امجد شبیر

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

جون ۲۰۱۹ء

وحید احمد کی ناول نگاری میں تہذیبی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ

("زینو" اور "مندری والا" کے حوالے سے)

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار

امجد شبیر

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو ئجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

جون ۲۰۱۹ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگو یجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: وحید احمد کی ناول نگاری میں تہذیبی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ
("زینو" اور "مندری والا" کے حوالے سے)

پیش کار: امجد شبیر

رجسٹریشن نمبر: 1254-MPhil/Urdu/F-16

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان و ادب اردو

ڈاکٹر روبینہ شہناز
نگران مقالہ
____

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان
ڈین فیکلٹی آف لینگو یجز
____

بریگیڈئر محمد ابراہیم
ڈائریکٹر جنرل
____

____
تاریخ

اقرارنامہ

میں امجد شبیر حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز اسلام آباد کے ایم۔فل سکالر کی حیثیت سے نگران ومعاون نگران ڈاکٹر روبینہ شہناز صاحبہ کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔

امجد شبیر

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جون ۲۰۱۹ء

فہرست ابواب

Abstract

A novel is a piece of long narrative in literary prose. Narrative prose is menat to entertain and tell a story. It is a description of a chain of events which includes a cast of characters, a setting and an ending.

The novel covers civilization, culture, social and psychology in human life. The novel is a contentment of civil liberties and historical facts.

“Analytical study of cultural elements in the novels of Wahid Ahmed based on five chapters.

The 1st chapter is based on basic discussions, which has been discussed regarding culture elements.

In 2nd chapter there is a discussion on various topics regarding the importance and need of culture elements in novel ‘zeno’. Topics related to political system, social values, social system, religion, economic system, environment, science and modernity are discussed. In part of this novel, Greek Civilization has made a subject.

In 3rd chapter there is also an analytical study of civil elements in the novel ‘Mundri Wala’. social values, political system, economic sources, social aspects, importance of human life in the society, terrorism, and other aspects of life are discussed.

Chapter 4th is based on comparative study of both novels. Both novels have different character to explore the concept of civilized behavior in the society where they exist. In this chapter discussed with regard to common elements and differences.

In 5th chapter comprised on the genral anlysis in which many outcomes and advantages have been presented.

اظہارِ تشکر

تکمیل مقالہ کے اس مواقع پر میں اللہ تعالیٰ کے بعد اپنے والدین کا شکر گزار ہوں جنہوں نے زندگی کے ہر موڑ پر میرے لیے آسانیاں پیدا کیں ان کی محبت و خلوص کا شمار ممکن نہیں۔ میں اپنی نگران محترمہ ڈاکٹر روبینہ شہناز سربراہ شعبہ اردو، جنہوں نے میری سربراہی بھی کی اور ہمیشہ مجھے مطالعہ کرنے کے لیے نئی کتابیں پڑھنے کی نصیحت کی۔ ان کی شفقت و خلوص پر ہم ان کے ممنون ہیں۔ دورانِ تحقیق جہاں بھی مشکل در پیش ہوئی مجھے آسان ترین الفاظ میں سمجھا کر اس مشکل کو آسانی میں بدل دیا اور میں تحقیق کام مکمل کرنے میں کامیاب ہوا۔

ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ سے بہت کچھ سیکھا اور انہوں نے مجھے لکھنے کی تحریک دلائی۔ ڈاکٹر عابد سیال کی رہنمائی میرے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ میں شعبہ کے تمام اساتذہ کرام کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر فاخرہ نورین صاحبہ کی نوازش کہ انہوں نے اس تحقیقی عنوان کے بارے میں اہم کتب سے نوازا اور نوجوان شاعر عمران عامی کا بھی شکریہ کہ انھوں نے نئی کتابیں پڑھنے کو دیں۔

میں نوجوان شاعر، ادیب اور نقاد جناب رفاقت راضی کا شکر گزار ہوں۔ انھوں نے مقالے کے تکمیلی مراحل تک نہ صرف مجھے لکھنے کی تحریک دلائی بلکہ مختلف کتابوں اور مقالے کے حوالے سے مفید مشوروں سے نوازا۔

امجد شبیر

اسکالر ایم۔ فل اردو

باب اول:

موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید:

i۔ موضوع کا تعارف:

اردو زبان وادب موجودہ دور میں عالمی ادب کے شانہ بہ شانہ کھڑا ہے اور اپنی اکثر اصناف میں بڑے تخلیق کار پیش کر چکا ہے۔ ان اصناف میں سے ایک صنف ناول ہے جو اگرچہ مغرب سے آئی ہے لیکن اردو ناول نگاروں نے اس میں متنوع اسالیب اور موضوعات پیش کر کے اسے ثروت مند بنایا ہے۔ کلاسیکی ادوار سے لے کر موجودہ (مابعد جدید) عہد تک ہر رنگ و حالت میں اردو ناول معرض ظہور میں آچکا ہے۔ موجودہ دور کے اہم ناول نگاروں میں سے ایک اہم نام وحید احمد کا ہے جو شاعری اور خاص طور پر نظم میں اپنی تخلیقی اُپج منوانے کے بعد ناول کے فن میں آئے اور اس میں جدید اسالیب سے اردو ناول کو آگے بڑھایا ہے۔ اُن کا پہلا ناول "زینو" ہے جو یونانی فلسفیانہ بحث کے حوالے سے معاصر صورتِ حال کو واضح کرتا ہے۔ ایسے ہی "مندری والا" اس سلسلے کا دوسرا ناول ہے جس میں نہ صرف فلسفیانہ بحث کا تسلسل ملتا ہے بلکہ تہذیبی عناصر کی ثنویت بھی اس میں ملتی ہے۔

ii۔ بیان مسئلہ:

اگرچہ مختلف اردوناولوں پر فرہنگ سے لے کر موضوعاتی سطح پر کام ہو چکا ہے لیکن بہت سے جدید ناولوں اور خاص طور پر وحید احمد کے ناولوں پر ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا اور بالخصوص تہذیبی عناصر کے حوالے سے یہ تحقیقی کام اپنی نوعیت کا پہلا کام ہو گا۔ جدید اور عصری تنقیدی مباحث میں تہذیبی عناصر کی ثنویت اہم سمجھی جاتی ہے۔ صنعتی ترقی کے آغاز کے ساتھ تہذیبی عناصر سے معاندانہ رویہ بھی سامنے آتا ہے۔ یہ بحث جب کسی ناول کا حصہ بنتی ہے تو بہت دلچسپ رخ اختیار کرتی ہے۔ اس مقالے میں تہذیبی عناصر کا کرداروں پر اثرات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انسانی صورتِ حال کو واضح کیا جائے گا۔

iii۔ مقاصد تحقیق:

مجوزہ تحقیق میں درج ذیل مقاصد پیش نظر کیے جائیں گے۔

ا۔ تہذیبی عناصر سے متعلق قدیم اور جدید مباحث کا احاطہ کرنا ہے۔

۲۔ وحید احمد کے ناول ''زینو'' اور ''مندری والا'' میں موجود تہذیبی عناصر سے متعلق مباحث کا احاطہ کرنا ہے۔

۳۔ دونوں ناولوں میں موجود تہذیبی عناصر سے متعلق وحید احمد کے فکر و فن میں معنوی ربط تلاش کرنا ہے۔

iv۔ تحقیقی سوالات:

درج ذیل سوالات کو پیشِ نظر رکھ کر تحقیق کی جائے گی۔

ا۔ تہذیبی عناصر کے قدیم اور جدید مباحث کی مختلف جہات اور نوعیتیں کیا ہیں؟

۲۔ ناول ''زینو'' میں موجود وہ کون سے تہذیبی عناصر ہیں جن کے متعلق وحید احمد کا منفرد اسلوبِ فکر سامنے آتا ہے؟

۳۔ ناول ''مندری والا'' میں موجود وہ کون سے تہذیبی عناصر ہیں جن کے متعلق وحید احمد کا خاص نقطۂ نظر سامنے آتا ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار:

میرے تحقیقی مقالے کا بنیادی موضوع وحید احمد کے ناولوں میں تہذیبی عناصر سے متعلق آنے والے مباحث، کرداروں، منظر نگاری اور ان کے متعلق وحید احمد کے نقطۂ نظر ملتا ہے۔ اس سلسلے میں غیر جانبداری کے ساتھ وحید احمد کے ناول سے متعلق فن اور فکر کو واضح کیا جائے گا اور جہاں جہاں اس حوالے سے اُن کی فکر میں نظریاتی اعتبار سے تنوع اور ارتقا سامنے آئے گا اس اُن کا بھی جائزہ لیا جائے گا تاکہ ناول نگار کے دونوں ناولوں میں ایک معنوی ربط قائم کیا جاسکے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار:

مجوزہ تحقیقی موضوع وحید احمد کی ناول نگاری میں تہذیبی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔اس لیے زیرِ نظر تحقیقی مقالے میں میرا طریقہ کار دستاویزی ہو گا۔بنیادی ماخذات کے ضمن میں زیادہ انحصار ناول ''زینو'' اور ''مندری والا'' پر کیا جائے گا۔ تحقیق میں انٹرویو، تحقیقی مقالات اور ادبی تحریروں کے علاوہ الیکٹرانک میڈیا، انٹرنیٹ، تحقیقی رسائل و جرائد وغیرہ سے استفادہ حاصل کیا جائے گا۔ مقالے میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ تہذیبی عناصر سے متعلق مباحث کی روشنی میں ''زینو''اور ''مندری والا'' کے تقابلی مطالعہ کو بھی پیش کیا جائے اور اس حوالے سے ناول نگار کے پہلے سے دوسرے ناول تک کے فکری ارتقا کا جائزہ بھی کیا جا سکے۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

اس موضوع پر کسی بھی لحاظ سے کام نہیں ہوا اور وحید احمد کے مذکورہ ناولوں پر بعض تنقیدی مضامین اگرچہ موجود ہیں لیکن جدید ناول ہونے کے ناتے سے جدید مباحث کی روشنی میں میری معلومات کی حد تک جامعاتی و غیر جامعاتی سطح پر کوئی کام نہیں ہوا۔

viii۔ تحدید:

اختیار کردہ موضوع کے تحت مقالہ نگاری میں مندرجہ ذیل امور پیش رکھے جائیں گے تاکہ موضوع جامع اور مانع رہے اور بے جا اختصار ار غیر ضروری تطویل سے بچا جا سکے۔

۱۔ بنیادی مباحث میں ناول، تہذیبی عناصر کی اجمالی تعریف اور اس کے بارے میں مستند مفکرین و ناقدین کی آرا کا اجمالی خاکہ پیش کیا جائے گا اور معاصر صورتِ حال کے ساتھ اس کی تطبیق کی جائے گی۔

۲۔ تہذیبی اور ثقافتی تناظر میں یونانی، اسلامی اور مغربی مفکرین کے بنیادی افکار سے بحث کی جائے گی اور اس سلسلے میں بنیادی آخذ سے استفادہ کیا جائے گا۔

۳۔ وحید احمد کے ناولوں کا موضوعاتی جائزہ تہذیبی و ثقافتی حوالے سے جدید لسانی مباحث کے تناظر میں پیش کیا جائے گا۔

ix۔ پس منظری مطالعہ:

اُردو ناول میں مراۃ العروس سے لے کر جدید عہد کے ناولوں میں سیاست، سماج، معیشت، مذہب، تہذیب، ثقافت، زبان، تاریخ اور فلسفہ کے حوالے سے ناول منظرِ عام پر آئے ہیں۔ مقالے کے پہلے باب میں اُن میں سے منتخب ناولوں کے موضوعات پر تحقیق کا مختصر جائزہ لیا جائے گا۔ خاص طور پر اکیسویں صدی میں شائع ہونے والے اہم ناولوں میں تہذیبی عناصر کے حوالے سے آنے والے موضوعات / مباحث پر ہونے والے تحقیقی اور تنقیدی مواد کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس سلسلے میں کوشش ہو گی کہ مطبوعہ تحقیقی اور تنقیدی کام کو بروئے کار لایا جائے گا۔ تہذیبی عناصر سے متعلق نظری اور فلسفیانہ مباحث میں بہت تنوع پایا جاتا ہے؛ مقالہ نگار کی کوشش ہو گی کہ مختلف آرا اور نقطۂ نظر سامنے لا کر وحید احمد کے ناولوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے نتائج مرتب کیے جا سکیں۔

x۔ تحقیق کی اہمیت:

اردو ناولوں میں اسالیب سے لے کر موضوعات تک ایک تنوع پایا جاتا ہے اور اسی طرح ایک بڑی تعداد میں اُردو ناول پر تنقید موجود ہے لیکن جدید اُردو ناول اور خاص طور پر اکیسویں صدی کی ابتدا میں ادبی افق پر نمودار ہونے والے ناولوں پر تہذیبی عناصر کے حوالے سے مباحث نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جدید ناول نہ صرف اپنی پیش کش میں نیا ہے بلکہ اپنے موضوعات اور مناہج میں جدید مسائل اور اسالیب کو سموئے ہوئے ہے۔ اس حوالے سے جدید لسانی و تنقیدی مباحث کو سامنے رکھتے ہوئے کام کرنے کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ اکیسویں صدی کی ابتدا میں لکھے جانے ناولوں کے مسائل اور تعین قدر اس سے ماقبل ناولوں سے مختلف ہے اور خاص طور پر وہ ناول جن میں جدید سائنسی، فلسفیانہ اور لسانی بحثوں سے استفادہ کرتے ہوئے ناول نگار نے سماجی، معاشرتی، معاشی اور ادبی جہات کی توسیع کی ہے مذکورہ ناول "زینو" اور "مندری والا" کا موضوعاتی مطالعہ تہذیبی عناصر کے تناظر میں کر کے جدید اُردو ناول کی تعیین قدر کی طرف قدم بڑھایا جائے گا اور اس سے نئے لسانی مباحث سے استفادے کے در وا ہوں گے۔

ب۔ تہذیب کی تعریف

تہذیب سے مراد کسی قوم کے بنیادی افکار اور نظریات ہوتے ہیں۔ ہر قوم ایک مخصوص زندگی گزارنے اور دوسروں سے مختلف عادات و اطوار کی حامل جانی جاتی ہے یہی وہ عناصر ہوتے ہیں جو اسے دوسری اقوام سے ممتاز کرتے ہیں۔ اس کی ظاہری شکل وصورت تہذیب کہلاتی ہے۔ تہذیب کے لغوی معنی آراستہ کرنے کے ہیں اور اصطلاحی حوالے سے تہذیب اس منظم طریقے کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کی خوبی، ذاتی اور اصلی حالت سامنے آجائے۔ جن اصولوں پر اجتماعی زندگی استوار ہوتی ہے اسے تہذیب کہتے ہیں۔

کثرت سے استعمال ہونے والا لفظ تہذیب جس کی تعریف بہت سے مفکرین نے کی لیکن آج تک کوئی متفقہ تعریف اور متفقہ حدود متعین نہیں کر سکی۔ البتہ سب کا اتفاق ہے کہ تہذیب جامع لفظ ہے جو معاشرے کی فکری زندگی اور ذہنی رغبت اور اس کی سوچ پر مشتمل ہے اور اس کے مادی اکتسابات اور مادی زندگی کے بارے میں سوچ بچار کرنا ہے۔ انسانی سماج بہت سی خصوصیات کا حامل ہے۔ جن میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر معاشرے میں انسان کی اپنی ایک تہذیب ہوتی ہے۔ تہذیب میں رسوم ورواج، مذہبی عقائد، سماجی تعلقات اور اخلاقی اصول اہم ستون ہیں۔ ایک معاشرے میں ثقافت ،روایات اور مختلف قدروں کو اگر دوسرے معاشرے یاملک کے حوالے سے دیکھیں تو ہر معاشرہ دوسرے معاشرے سے کسی نہ کسی حوالے سے مختلف ہوتا ہے۔ تہذیب کے آئینے میں ملک، قوم، مذہب ایک مکمل تصویر کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ آب وہوا بھی بہت حد تک تہذیبوں کو بنانے میں پیش پیش رہتی ہے۔ علاقائی رقص، گانے اور زبان وادب کسی بھی تہذیب کے بنیادی عناصر ہوتے ہیں۔ ہر معاشرے کے اپنے بہت تاریخی یادگار واقعات ہوتے ہیں جنھیں آگے منتقل کرنا ہوتا ہے تاکہ آگے آنے والی نئی نسلوں کے لیے آسانی ہو اور تہذیب کو بنانے کے ساتھ ساتھ اسے محفوظ رکھ سکیں۔ لغوی معنی میں تہذیب کو اچھی بری دونوں قسم کی تہذیبوں کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔ سبطِ حسن کے مطابق:

> "کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔ تہذیب معاشرے کی طرز زندگی اور طرز فکر واحساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چنانچہ زبان، آلات واوزار پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے رہن سہن، فنونِ لطیفہ، علم وادب، فلسفہ وحکمت، عقائد وافسوں، اخلاق وعادات ورسوم وروایات، عشق ومحبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔ "[1]

تہذیب ثقافتی تخلیق کو فروغ دے کر معاشرے میں زندگی گزارنے کا ایک بہترین راستہ متعین کرتی ہے چنانچہ بول چال، سماجی معاشرتی رشتے، اخلاقی اقدار، رہن سہن، عادات، رسومات، علم وفنون، فنونِ لطیفہ، عشق ومحبت وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر کہلاتے ہیں۔ سید عابد حسین نے اس حوالے سے لکھا:

"تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شعور کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے۔ جسے وہ اپنے اجتماعی اداروں میں ایک معروضی شکل دیتی ہے جسے افراد اپنے جذبات ورجحانات، اپنے سبھاؤ اور برتاؤ میں اور ان اثرات میں ظاہر کرتے ہیں جو وہ مادی اشیا پر ڈالتے ہیں۔"[۲]

تہذیب کا تعلق جہاں فرد کی پسند ناپسند، دلی رجحانات، زندگی گزارنے کے طریقوں کے ساتھ ہوتا ہے وہیں فرد کسی بھی سماجی اکائی یا معاشرتی ادارے سے کٹ کر تہذیبی دھارے میں شامل نہیں ہو سکتا۔ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے سید عابد حسین کا کہنا ہے کہ:

"تہذیب کے متعلق جو ہم نے بحث کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تہذیب کی حامل ایک انسانی جماعت ہوا کرتی ہے جسے معاشرہ یا سماج کہتے ہیں۔ اس معاشرے یا سماج میں اگر تہذیبی وحدت کے ساتھ سیاسی وحدت بھی پائی جائے تو اسے آج کل کی اصطلاح میں قوم کہتے ہیں۔"[۳]

یعنی قوم معاشرے میں ایک جماعت کی صورت اپنا مقام واضح کرتی ہے، ایک تحریک کی صورت اپنے معاملات کو پیش کرتی ہے جن میں اُن کے جذبات، رجحانات اور ان کی ضروریات کی چیزیں ہوتی ہیں۔ معاشرتی وارثت کے مختلف عناصر میں تہذیب ایک اہم عنصر ہے۔ اس کا تعلق سوچ بچار اور مختلف نظریات کے ساتھ ہے۔ جن کو معاشرے کے افراد اپناتے ہیں جس کا نتیجہ انھیں عملی زندگی کی مختلف صورتوں میں ملتا ہے۔ تہذیب معاشرتی اور سماجی تبدیلیوں کا موجب ہے اور تہذیب معاشرے کا ایک اہم پہلو ہے جس کا تعلق معاشرے کے افراد کے ساتھ ہے۔ تہذیب کے حوالے سے ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر اپنی کتاب مطالعہ تہذیب میں لکھتی ہیں:

"اصطلاحاً تہذیب سے مراد انسان کا نظام فکر ہے۔ یعنی انسان کے وہ عقائد نظریات وافکار جن سے اس کی شخصیت بنتی اور سنورتی ہے۔ اس کے خیالات جتنے زیادہ پاکیزہ، روشن اور سلجھے ہوئے ہوں گے وہ معاشرے کا اتنا ہی مہذب شخص متصور ہو گا۔ تہذیب کا تعلق

انسانی فکر و خیال اور ذہن سے ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے تہذیب کی کیفیت نظریاتی، فکری، روحانی اور غیر مادی ہوتی ہے۔''[۴]

حضرت آدم و حوا سے انسانی نسل کی ابتدا ہوئی اور بتدریج بڑھتی اور پھیلتی رہی اور اس طرح یہ انسانی نسل مختلف خاندان اور قبائل کی صورت میں وجود میں آئی اور زمین پر آبادیاں بڑھنے لگیں۔ انسانی زندگی کا نظام بننے لگا اور لوگوں نے اپنی سوچ سمجھ کے مطابق اپنی زندگی کو گزارنے کے راستے چنے اور معاشرہ بننے لگا۔ کچھ لوگوں نے نظامِ فکر کو افکار و خیال کے تحت عملی، مادی اور ظاہری حیثیت دی۔ تہذیب کا تعلق انسانی فکر اور نظریات اور عقائد سے ہے اور تمدن کا ظاہری اعمال سے ہے۔ اس لیے تہذیب کا تمدن کے ساتھ گہرا تعلق ہے کیونکہ تمدن تہذیب کی وجہ سے ہے۔ جغرافیائی، حیاتیاتی اور نظریاتی عناصر ہی انسانی معاشرے کی بنیاد ہیں۔

جہاں مختلف جینیات، نسل، رنگ، مذہب اور مختلف زبان کے لوگ رہتے ہیں۔ وہاں ایک نیا کلچر بھی وجود میں آتا ہے۔ کسی بھی تہذیب کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایسی اخلاقی اقدار و روایات پر قائم ہو جس کا تعلق عقیدہ، زندگی گزارنے کے طور اطوار، مقصد، سوچ بچار پر مبنی ہو۔ اس طرح معاشرہ اپنے اندر روحانی، نفسیاتی اور معاشرتی ورثہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو ایک تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے۔ اگر معاشرے کے افراد مثبت انداز میں ان چیزوں کے بارے میں نہ سوچیں تو کبھی بھی اخلاقی معاشرتی اقدار کا جنم نہیں ہوتا جس کا نقصان آفاقی اصولوں سے محروم ہونا ہے۔ اس طرح معاشرہ اپنی ثقافت کو نہیں بچا سکے گا جس کی وجہ بڑی تہذیب تشکیل کے مراحل سے نہیں گزر سکتی ہے۔

تہذیب ایک ایسی نشو و نما کی جگہ ہے جس میں انسانیت پھیلتی پھولتی ہے اور انسان کا تشخص قائم و دائم ہوتا ہے اور انسانیت نکھرتی ہے۔ تہذیب کا تعلق بظاہر فکریات کے ساتھ ہے۔ لفظ تہذیب میں قدرت کا پھیلاؤ ہے اور یہ لفظ زندگی گزارنے کے طور اطوار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک قوم کو دوسری قوموں سے مختلف طرزِ زندگی دینا بھی تہذیب کے مرہونِ منت ہے۔ معاشی بہم رسانی، سیاسی تنظیم، اخلاقی روایات اور علم و فن کی جستجو یہ چار عناصر کے ملنے سے تہذیب وجود میں آتی ہے۔ تہذیب کے راستوں میں مختلف عوامل پائے جاتے ہیں جو اس کی راہ میں روکاٹ یا اس کے لیے موزوں رہتی ہے۔ ارضیاتی اور جغرافیائی حالات تہذیب کے پھیلاؤ اس کی تقویت کے لیے مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ معاشرے میں مختلف نسلیں بستی ہیں تہذیب کے لیے اس کی کوئی قید نہیں اور دلچسپی یا شرط لازم نہیں ہے یہ کسی بھی رنگ و نسل میں پروان چڑھتی ہے۔ تہذیب ایک جڑ کی حیثیت رکھتی ہے

اور تمدن اس مختلف شاخوں کی صورت مختلف اطراف میں پھیلی ہوئی ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ تہذیب ایک صاف ستھرے گھر کی مانند ہے جسے ہم سے پہلے آنے والوں نے بنایا سجایا ہے اور ہم نے اسے مزید ترقی کی طرف گامزن کیا ہے اس کی ظاہری صورت کو تبدیل کیا ہے۔

افراد واقوام کی طرح تہذیبیں بنتی اور مٹتی رہتی ہیں۔ دنیا کی نئی پرانی تہذیبوں کو بننے کے لیے جغرافیائی حالات، معاشی عوامل، اخلاقی روایات اور علم وفن کی ہمیشہ ضرورت پیش آتی ہے۔انسان ایک معاشرتی حیوان ہے، معاشرے کے بغیر اس کی بقا محال ہے لہذٰا معاشرتی اقدار کے حوالے سے معاشرے کا ہر فرد اپنے دور، قوم اور اپنے ملکی تہذیب کا پابند ہوتا ہے۔علاوہ ازیں اس پر جغرافیائی حالات اثر انداز ہوتے ہیں اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جغرافیائی حالات کے اختلاف سے تہذیب کی جزئیات میں اختلاف سامنے آتا ہے کیونکہ تہذیب ساری انسانیت کی زندگی پر محیط ہے۔ ہر وہ شے جو انسانیت کی اصلاح اور خیر کے لیے موجود ہو وہ تہذیب کا حصہ ہے۔زندگی کے مادی لوازمات کو تقویت پہنچتی ہے تمام سیاسی و اقتصادی اور معاشرتی ادارے اور تنظیمیں اس سر چشمے سے سیراب ہوتی ہیں۔ تہذیب کی ہیئت متشکل ہوتی ہے اور یہ بذات خود قوت نہیں ہے بلکہ اس کی اصل قوت وہ علم ہے جو بنیادی طور پر ذہنی اور اخلاقی اقدار سے وابستہ ہے اور اس علم کا اصل راستہ مذہب، قوانین اور اخلاقی قواعد ہیں۔بقول سید عابد حسین:

> ”اس کے سب سے زیادہ مشہور معنی ہیں: پاکیزہ اخلاق وآداب۔ جس شخص کی طبیعت، چال ڈھال، گفتگو اور برتاؤ میں ایک خاص موزونیت اور دلکشی ہو وہ مہذب کہلاتا ہے۔ ان مادی چیزوں پر بھی تہذیب کا اطلاق ہوتا ہے جو انسان کے حسنِ ذوق اور حسنِ عمل سے وجود میں آئی ہیں۔ مثلاً ہم مغلوں کی عہد کی عمارتوں، باغوں اور تصویروں کو مغلیہ تہذیب کے آثار کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی قوم کے اجتماعی ادارے اور اصول قوانین بھی تہذیب کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں جیسے قدیم یونانیوں کا نظام ریاست اور نظام تعلیم یا قدیم رومیوں کا نظام قانون ان قوموں کی تہذیب کے اہم عناصر سمجھے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تہذیب کا لفظ اس سے زیادہ مجرّد اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے یعنی زندگی کا مکمل نصب العین جو کسی قوم کے سامنے ہو، ان معیاروں کا ہم آہنگ تصور جن پر وہ اپنی اور دوسروں کی زندگی رکھتی ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مغرب کی تہذیب کی بنا مادیت پر

رہے اور مشرقی تہذیب کی روحانیت پر تو تہذیب کا یہی مفہوم ہمارے پیش نظر ہوتا ہے۔"[۵]

تہذیب کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی بھی قوم کی تہذیب اس کے مذہبی عقائد خیالات، مختلف رسوم اور لباس، تقریبات، خوشی غمی کے اظہار کے طریقے اور مختلف قسم کی تفریحات، کھیل کود مراد ہیں۔ فنون لطیفہ مختلف علوم تہذیب کے مظاہر میں آتے ہیں۔ ہر قوم کی اپنی پہچان اس کی تہذیب سے ہی واضح ہوتی ہے۔ اس لیے قومیں ایک دوسروں سے امتیاز اور انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہمیں تہذیب کے حوالے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ تہذیب کے اصول وضوابط بعض مستقل ہوتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل بھی ہوتے رہتے ہیں۔ تہذیب پہاڑوں میں رہنے والوں کی اور میدانی علاقوں میں رہنے والوں کی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ تعلیم اور تمدن کے حوالے سے بھی فرق پڑتا ہے۔ تمدن اور تعلیم کے راستوں میں جو قومیں آگے بڑھتی رہتی ہیں وہ دوسروں سے جدا ثابت ہوتی ہیں۔

اسلام سے قبل جن تہذیبوں نے اس دُنیا میں اپنا پڑاؤ ڈالا اور اپنی نسل کو بڑھایا ان میں سب سے پہلی تہذیب سمیری تہذیب تھی جو جنوبی عراق میں شمال کی جانب آکر آباد ہوئی۔ اس تہذیب کے لوگ صنعت کاری میں دھات کا استعمال کرتے تھے۔ اور کمہار کا چاک اسی تہذیب نے متعارف کرایا۔ اس کے بعد مصری تہذیب نے اپنا قدم جمائے۔ اس تہذیب میں سامی، لیبیا، توبیاتی، مغربی ایشیا اور سوڈانی لوگ شامل تھے۔ اسے مخلوط تہذیب کا نام بھی دیا گیا جو کہ ثقافتی اعتبار سے توانا ثابت ہوئی۔ اس تہذیب کے بعد حتّی تہذیب (آریائی نسل سے تعلق رکھنے والی) وجود میں آئی۔ یہ لوگ بحیرہ کیپسن میں آکر آباد ہوئے۔ پھر شام سے ان کے بہت سے قبائل اناطولیہ میں آئے۔ اس تہذیب نے پچھلی تہذیبوں سے بہت کچھ سیکھا۔ اس کے بعد فونیقی تہذیب وجود میں آئی یہ لوگ سامی نسل سے تھے۔ یہ خلیج فارس کے علاقے سے ساحلِ شام کے علاقوں میں پھیل گئے اور یہاں انھوں نے مختلف دستکاریوں کے مراکز قائم کیے۔ اس تہذیب کی مشہور بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تہذیب کی زبان کی آوازوں کو بائیس حروفِ تہجی دیے اور لکھنے کا آغاز بھی کیا۔ یہ تہذیب اسپین تک پھیل گئی اور اس کے افراد رفتہ رفتہ اپنی نو آبادیاں بھی قائم کرتے گئے۔ معلوم وجدید دُنیا کی مختلف تہذیبوں میں پہلی بنیاد گزار تہذیب یونان کی تہذیب ہے، اس کے بعد آنے والی تمام تہذیبیں بالواسطہ یا بلاواسطہ یونانی تہذیب کی خوستہ چین یا کم از کم جزوی حوالے سے اثر پذیر ضرور رہیں۔ حتیٰ کہ اسلام کے جملہ علوم کی تدوین وترسیل میں یونانی تہذیب کی علمیات اور

اس کے فلسفے نے واضح اثرات ڈالے اور یونانی تہذیب کے بہت سے دستاویزی حصے یونانی زبان سے عربی میں منتقل ہو کر یورپ تک پہنچے۔ اس تہذیب نے سقراط، افلاطون، ارسطو، زینو اور اسکندر جیسے لیڈر اور فلاسفر زپیدا کیے۔ یورپ نے اسی تہذیب کو دیکھتے ہوئے مادی ترقی کو آگے بڑھایا۔ یونانی تہذیب کے بعد ایرانی تہذیب نے اپنے قدم جمائے اور جنوب مغربی ایران میں اپنی آبادکاریاں کیں۔ یہ تہذیبی اور عسکری حوالے سے ایک طاقت ور تہذیب ثابت ہوئی اس لیے اسے پہلی سپر طاقت بھی کہا جاتا ہے۔ اس تہذیب کے بعد ہندی تہذیب آئی۔

ج۔ ثقافت:

انسانی گروہ کا کسی خاص علاقے میں مل جل کر کسی خاص ماحول اور ضرورتوں کے تحت کسی زبان، رسم ورواج، لباس اور اقدار کے مطابق زندگی گزارنا ثقافت کہلاتا ہے۔ رسم ورواج اور سماجی اقدار کے دوران مختلف موسموں اور آلاتِ پیداوار سے مدد لینا اور بدلتے ادوار میں تہذیب و تمدن کا بڑھتے رہنا ضروری ہوتا ہے۔

ثقافت اقوام کے اجتماعی طرز زندگی کا نام ہے۔ نسل در نسل قوموں کے اطوار، فضائل، عادات ورسوم اور اقدار و روایات پروان چڑھتے ہوئے تہذیب کے روپ میں آ جاتے ہیں۔ کسی بھی قوم کی وابستگی عقیدے، زندگی کے طوراطوار اور مقصد کے بارے میں جاننا ہے ۔ ثقافت نفسیاتی، معاشرتی اور روحانی اثاثہ سمجھا جاتا ہے۔ جس سے کسی بھی قوم کی تاریخ کے بارے میں آسانی سے جانا جاتا ہے۔ ثقافت اگر مثبت معاشرتی سے روحانی اقدار کو پروان چڑھا سکے تو وہ اپنی اہمیت کھو دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے ایک بڑی تہذیب بنانے سے قاصر رہتی ہے۔ اس لیے بہت ضروری ہوتا ہے کہ ثقافت اپنی اساس کے مطابق اصولوں پر قائم رہے، بنیادی اقدار کی ترجمانی کرے جس سے ایک اچھی تہذیب وجود میں آسکتی ہے۔ ثقافت دو حصوں میں تقسیم کی جاتی ہے پہلے حصے میں ہم ان معاملات کو مد نظر رکھتے ہیں جن کا تعلق نظر آنے والی چیزوں سے ہوتا ہے اور ان امور کا معاشرے کے لوگوں پر گہرا اثر پڑتا ہے اور اس سے آنے والے حالات کا تعین کیا جاتا ہے۔ ان امور کا نتیجہ جلد منظر عام پہ نہیں آتا ہے اس کے لیے ایک طویل عمل پیہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے لباس کا استعمال کہ کون سے موسم میں کیا لباس پہنا جائے۔ اسی طرح مادی ترقی کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے کہ گھر، مکان اور پلازے، ہسپتال کس طرح بنائیں جائیں۔

ثقافت کا دوسرا جز انسانی جذبات، رویوں، معاملات، افکار، نظریات اور عقائد پر مشتمل ہوتا ہے۔ ثقافت کے یہ امور بظاہر نمایاں اور واضح نہیں ہوتے لیکن ان امور کے اثرات معاشرے میں ترقی کا راستہ ضرور بنتے

ہیں۔ ان امور میں ذاتی اور سماجی طرز زندگی، اخلاقی اقدار، روایات، دوستی وغیرہ۔ ثقافت معاشرے کے ڈھانچے میں روح، جان کی حیثیت سے جانی جاتی ہے۔ دوسری قوموں سے آگے بڑھنے کے لیے بھی کچھ قومیں تہذیب و ثقافت کو ترجیح دیتے ہیں۔ دنیا میں کامیاب قومیں ثقافتی بنیادوں پر دوسری قوموں کو نشانہ بناتی ہیں یہ طریقہ کار نئی چیزیں نئی سوچیں قوم میں لاتا ہے جس سے قومیں بیدار ہوتی ہیں اور نئے نظریات اور طرزِ عمل کو مستحکم بناتے ہیں۔ ثقافتی امور پر عدم توجہ سے معاشرے کے اندر قوانین، سیاسی، اقتصادی، سماجی اور علمی حوالے سے کوئی کام نہیں ہوتا بلکہ معاشرے پر منفی اثرات مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ثقافتی سرگرمیوں کے لے منصوبہ بندی ضروری ہے۔ ہنری تھامس بکل اپنی کتاب تاریخ تہذیب و تمدن میں لکھتے ہیں:

> ”تمدن کا سب سے بڑا ثمرہ یہ ہے کہ قوت اور اقتدار اشخاص منفرد اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ہاتھوں سے نکل کر جمہوریہ عوام کے ہاتھوں میں پہنچ جائے اور روز بروز عوام الناس کا زرو بڑھتا اور افراد واحد کا زور گھٹتا رہے۔ تمدن کی فطری ترقی سے ایک شخص واحد قوت، دیانت اور اہمیت بمقابلہ جمہوریہ کے بہت بے حقیقت ہو جاتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نوع انسانی میں اقتدار اور قوت کے حاصل ہونے کے دو ابتدائی سبب ہیں۔ اولاً جائداد اور دولت اور دوسرے نفس کی وہبی قوتیں اور کسبی کمالات اور یہ دونوں تمدن کی بالکل ابتدائی حالت میں صرف چند افراد خاص کے قبضے میں ہوتی ہیں۔“[۲]

معاشرے میں ثقافتی انسانی رویوں کی بہت اہمیت ہے۔ کسی بھی معاشرے کی پہچان اس کی ثقافت سے ہی ممکن ہے۔ ثقافت سے تہی کا مطلب اپنے نقوش کو مٹانے کے مترادف ہے۔ انسانی زندگی میں ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے جس میں نئی راہوں کا کھلنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ آنے والی نسلوں کے لیے آسانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے ہر معاشرے میں ایسی حکمت عملی کا قائم ہونا بہت ضروری ہے تاکہ ثقافت کے بہتر نقوش باقی رہ سکیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس جدید دور میں ذرائع ابلاغ اور آمدورفت نے بہت ترقی کی ہے۔ جب انسان اپنے ماحول سے کٹ جاتا ہے تو انسانی زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر روتھ بیٹی ڈکٹ کا ثقافت کے خدوخال کی تعین کے بارے میں کہنا ہے:

> ”زندگی کا خاص طرز اور ماحول کا دباؤ (اور انسانی تخیل کی زرخیزی کا تو کہنا ہی کیا) ایسی حیرت انگیز اور نئی نئی راہیں کھولتا ہے جنھیں اپنا کر معاشرہ ہر دم رواں دواں رہتا ہے۔ مثال کے طور پر ملکیت کے قوانین جو معاشرے میں طبقات و مدارج پیدا کرتے ہیں۔ مادی اشیا جن

میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا ایک مکمل علم حرفت (ٹیکنالوجی) ہوتا ہے۔ جنسی زندگی کے بے شمار پہلو جن میں ماں باپ بننے سے لے کر بعد کے سارے مراحل شامل ہیں۔ طرح طرح کی انجمنیں اور ادارے جو مل جل کر معاشرے کو ایک خاص وضع اور سانچا بخشتے ہیں۔ معاشی لین دین کا نظام دیوی دیوتا اور کچھ دوسرے فوق الفطرت محرکات۔ ان میں سے ہر ایک اور ان کے علاوہ اور بھی بے شمار راہیں ایسی ہیں جن پر چلتے چلتے رسوم جنم لیتی ہیں اور ثقافت کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ سب راہیں مل جل کر ثقافتی توانائی و قوت کو مجتمع کر کے اپنے اندر سمو لیتی ہیں اور بچی کھچی قوت کو دوسری خاصیتوں کی تشکیل پر صرف ہونے کے لیے چھوڑ دیتی ہیں۔ زندگی کے وہ پہلو جو ہمارے نزدیک نہایت اہم ہیں، ان اقوام کے لیے کوئی قیمت نہیں رکھتے جن کی ثقافت ہماری ثقافت سے مختلف ہے، حالانکہ انھوں نے کسی اور نہج پر کمال و عروج حاصل کر رکھا ہے یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک خاصیت، جو ثقافتوں میں مشترک ہو، کسی ایک ثقافت میں اس حد تک درجۂ تکمیل حاصل کرے کہ دوسری ثقافت والے اسے عجیب اور مضحکہ خیز قرار دیں۔"

جس معاشرے یا ملک میں نئی ٹیکنالوجی قدم رکھتی ہے؛ وہاں ایک نئے کلچر کی راہیں کھلتی ہیں۔ جس ملک میں نئی راہیں بنتی ہیں نئی ٹیکنالوجی پر ایک نیا نظام مرتب ہوتا ہے اور ایک سوال یہ بھی یہاں پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس نئے دور میں نئی ٹیکنالوجی کے ہونے سے کسی بھی ملک کا مستقبل اور اس کی ثقافت کے نقوش بر قرار رہ سکتے ہیں۔

د۔ عقائد، عبادات:

معاشرے میں موجود روایات سے بنیادی طور پر انسانی عقائد کا اظہار ہوتا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ اپنے عقیدے کو مخصوص طریقہ سے ظاہر کرے۔ عقائد اور عبادات کے یعنی مذہب کے بغیر تہذیب کے بارے میں جاننا مشکل ہوتا ہے۔ مختلف تہذیبوں کے اندر مختلف مذاہب کی تاریخ ملتی ہے اور یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ بعض لوگوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

کسی بھی معاشرے میں رہنے والے لوگوں کے اعمال اُن کا طریقہ کار ہوتا ہے جس کے پس پردہ ان کے عقائد و عبادات نظریات اور تصورات کار فرما ہوتے ہیں۔ عقائد کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے کہ انسان نے خود سوچنا ہوتا ہے کہ اُس کا وجود کیا ہے ؟ اُس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ زندگی اور موت کا نظریہ کیا ہے؟ معاشرے میں ہر فرد جب اس طرح سوچتا ہے تو ان عقائد کی وجہ سے تہذیب وجود میں آتی ہے۔ معاشرے میں

رہنے والے افراد مختلف نظریات رکھتے ہیں۔ خدا کے وجود پر ایمان رکھنا اور اس کے بارے میں جاننے کی جستجو رکھنا اور مختلف طریقوں سے اس کے ساتھ تعلق کا اظہار کرنا۔ خدا سے تعلق کو عبادات سے ظاہر کیا جاتا ہے یعنی مسلمانوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں عقائد کے ذکر کرنے کا مطلب عقیدہ توحید ہے یعنی خدا کو جاننا اور اسے ایک ماننا ہے۔ مسلمانوں کی تہذیب میں عقائد و عبادات کی اہمیت کس قدر ہے۔ طاہر حمید تنولی لکھتے ہیں:

> ''اسلامی تہذیب و ثقافت کا اولین عنصر ترکیبی توحید ہے۔ توحید وہ بنیادی تعلیم ہے جس کا ابلاغ اسلام کا اولین مقصد تھا۔ اگر اسلامی ثقافت کی ہمہ جہت نشوونما اور عالم گیر ارتقا کا جائزہ لیا جائے تو باوجود علاقائی، جغرافیائی، نسلی اور لسانیاتی تنوع کے جو عنصر ایک قدر مشترک کے طور پر موجود ہے وہ عقیدہ توحید ہے۔ توحید ہی اسلامی تہذیب و ثقافت کی وہ قوت ہے جس کا مقابلہ کوئی بھی عقیدہ، آئیڈیالوجی یا نظام زندگی نہیں کر سکا۔''[۸]

دینِ اسلام کی تہذیب و ثقافت میں توحید کے بعد سب سے اہم جز اطاعتِ رسول ہے اور حقیقت میں یہ دونوں اجزا ایک دوسرے سے منسلک ہیں کہ اطاعتِ رسول کا مطلب ذاتِ باری کو ماننا اور اس کے احکامات کو ماننا ہے۔ اگر اسلام کے عناصر ترکیبی میں سماجی معاشرتی معاملات کو دیکھیں تو ایمان دین کے مذہبی پہلو کو اجاگر کرتا ہے اور یہی وہ عقائد ہیں جن پر مذہب اسلام زندگی گزارنے کے طریقے بتاتا ہے یعنی زندگی کا وہ ضابطہ عمل اور نظام قانون جو دین کے بنیادی عقائد سے ہٹ کر نہ ہو وہ اسلام ہے۔

مذہب میں کوئی چیز کسی شخص کی ملکیت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ معاشرے کے افراد مل جل کر زندگی بسر کرتے تھے مگر یہ بات زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی طاقت ور نے کمزور کو دبانا شروع کر دیا۔ طاقتور شخص سردار کہلانے لگا اور اس کی فرمانبرداری کرنا لازم ہو گیا۔ سردار کی زندگی میں ہی اسے عزت نہیں بخشی جاتی تھی بلکہ اس کے مرنے کے بعد اسے دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ ول ڈیورانٹ کے مطابق:

> ''ہم نہیں جانتے کہ قدیم مذہب میں کب سورج نے آسمانوں کے بادشاہ کی حیثیت سے چاند کی جگہ لے لی۔ غالباً یہ اس وقت ہوا جب کاشت نے شکار کی جگہ لے لی۔ سورج کے سفر نے فصل بیجنے اور کاٹنے کے موسموں کو متعین کیا اور حرارت کو زمین کی زرخیزی کی وجہ تسلیم کیا گیا۔ تب سورج کی شعاعوں سے زرخیز ہونے والی زمین دیوی بن گئی اور انسان نے اس عظیم کُرے کو تمام اشیاء کے باپ کی حیثیت سے پوجنا شروع کر دیا۔ اس سادہ

ابتداسے سورج کی پوجا قدیم انسانوں کے عقائد میں شامل ہوگئی اور بعد کے کئی دیوتا تو محض سورج کی ہی تجسیم تھے۔ یونانی علماء نے انکساگورس کو اس بناپر وطن بدر کر دیا تھا کہ اُس کے نزدیک سورج دیوتا نہیں بلکہ فقط آگ کا ایک گولا تھا جس کا سائز تقریباً پیلو پونیس جتنا تھا۔ قرونِ وسطی میں سورج پوجا کی نشانی صوفیاکے سروں پر رکھا نورانی تاج تھا۔ ہمارے اپنے عہد میں جاپان کے بادشاہ کو اُس کی زیادہ تر رعایا سورج دیوتا کی تجسیم سمجھتی ہے۔ شاید ہی کوئی توہم اتنا پرانا ہو لیکن یہ آج بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ تہذیب اقلیت کی غیر معین محنت اور تعیش ہے جبکہ انسانوں کی اکثریت بڑی مشکل سے ہزارہا سالوں میں تبدیل ہوتی ہے۔۔۔ سورج اور چاند کی طرح ہر ستارہ دیوتا تھا اور اپنے اندر مقیم روح کے حکم پر حرکت کرتا تھا۔ عیسائیت کے زیر اثر یہ ارواح رہنما فرشتے بن گئیں ار کیپلر کا ان پر یقین زیادہ سائنسی سوچ کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ آسمان بذاتِ خود ایک عظیم دیوتا تھا جو بڑی عقیدت کے ساتھ بارش برسانے اور روکنے والے کی حیثیت سے پوجا جاتا تھا۔ بہت ساری قدیم قوموں میں دیوتا لفظ کا مطلب ہی آسمان تھا، لباری اور ڈنکانہ میں اس کا مطلب بارش تھا۔ منگولوں کا سب سے بڑا دیوتا ٹینگری(آسمان) تھا۔ چین میں تائی (آسمان) ایرانیوں میں آہورایعنی نیلگوں آسمان۔ ویدہندوستان میں یہ دیاس پتر یعنی آسمان باپ، یونانیوں میں یہ زیوس یعنی آسمان تھا۔ خود ہمارے یہاں لوگ اب بھی اپنی حفاظت کے لئے ، آسمان(Heaven) سے فریاد کرتے ہیں۔ زیادہ تر قدیم دیومالا کا مرکزی نقطہ زمین اور آسمان کا بار آور ملاپ ہے۔"[9]

قدیم دور میں سورج کی پوجا کرنے والے نے سورج کو دیوتا سمجھتے اوراپنی خواہشات کا اظہار سورج سے کرتے اورروزمرہ زندگی کے معاملات میں ان کے دیوتا سورج کا بڑا عمل دخل سمجھا جاتا تھا۔ موسم میں تبدیلی اور ان کی فصلوں کا پکنا یعنی خوراک کا مہیا ہونا بھی سورج دیوتا کے ہی مرہونِ منت سمجھا جاتا تھا۔ سورج کی مدد سے زمین کا دیوی بننا بھی ان کے یقین میں شامل تھا۔ اس تہذیب کے لوگ سورج دیوتا کے خلاف بات سننا پسند نہیں کرتے تھے اگر ایسا ہو تا تو اس تہذیب کے سردار جو ہمیشہ اپنے لوگوں کو سورج کی پوجا کرنے کی تلقین کرتے؛ وہ اُن لوگوں کو دربدر کر دیتے جو سورج کو محض ایک آگ کا گولا سمجھتے تھے۔ قدیم دور میں درختوں کو بھی انسان جیسا سمجھا جاتا تھا۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ انسانوں کی طرح ان درختوں میں بھی روح ہوتی ہے اور اس لیے ان کو کاٹنا ان

کو قتل کے مترادف ہے۔ قدیم دور کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ بہت سے گاؤں ایسے تھے جن کے لوگ جنگلات کی پوجا کرتے تھے۔ درختوں، دریاؤں، ندیوں اور پہاڑوں کی عبادت کے بارے میں یورپ کے ساتھ ساتھ ایشیا میں بھی قدیم دور میں شواہد ملتے ہیں۔ پہاڑوں کو غیر معمولی رتبہ حاصل تھا کیونکہ ان معاشروں میں یہ اعتقاد تھا کہ ان پہاڑوں میں مقدس دیوتا رہتے ہیں لہٰذا یہ پہاڑی سلسلے اہمیت رکھتے ہیں۔ زلزلوں کے آنے کی اصل وجہ دیوتاؤں کا غصہ اور کروٹ بدلنا ہے۔

انسانی ثقافت اور تہذیب وتمدن میں عبادات اور پوجنے کی ظاہری رسومات سے لے کر انسان کے سوچنے کے عمل، اس کے نظریات، اعتقادات، فکریات اور طرز ہائے زندگی میں وقت اور جگہ کے ساتھ ساتھ تنوع پایا جاتا ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر سے جب انسان جنگل میں رہتا ہے اور ابھی انسانی معاشرہ مادی تہذیب کی شکل میں سامنے نہیں آیا تھا کہ اس دور میں انسان جانوروں کا شکار کر کے اپنا پیٹ بھرتا تھا اور اس ماحول میں اس کے لیے ہر اجنبی پر ہیئت مظہر فطرت کو دیوتا / دیوی سمجھتا تھا۔ جب انسانی معاشرے میں زراعت کا عمل دخل ہوا تو انسان نے بہت تیزی کے ساتھ مادی ترقی حاصل کر لی اور نئے طرز کے مظاہر فطرت جیسے بادل وغیرہ کو محرکِ حقیقی سمجھا اور پوجا کے لیے نئے دیوی / دیوتا وضع کیے لیکن شکار کے دور کے مظاہرِ فطرت اس کے طرزِ عبادت میں کسی نہ کسی طور شامل رہے۔ دُنیا کی مختلف تہذیبوں میں مختلف ادوار میں کیا کیا علائم عبادت و پرستش رہے ہیں اور کلی یا جزوی طور پر ان علائم کا انسانی عبادات و رسومات میں کیا عمل دخل رہا ہے۔ اس کے بارے میں ول ڈیورانٹ کا تجزیہ یہ ہے کہ:

> ”قدیم مصری جواہر (بھونرے کی شکل کا) سے لے کر ہندوؤں کے ہاتھی تک شاید ہی کوئی جانور ہو جس کی کہیں نہ کہیں دیوتا کے طور پر پوجا نہ کی جاتی ہو۔ اجیب وا کے انڈین اپنے مخصوص مقدس جانور کو طوطم کا نام دیتے اور جو جرگہ اس کی عبادت کرتا اُسے اور جرگے کے ہر رُکن کو وہی نام دے دیا جاتا۔ یہ مبہم لفظ بشریات میں طوطم مت کے طور پر داخل ہو گیا جو مبہم طریقے سے کسی خاص چیز کی عبادت پر دلالت کرتا ہے جو کسی گروہ کے لئے خاص طور پر مقدس ہوتا۔ یہ زیادہ تر کوئی جانور یا پودا ہوتا تھا۔ طوطم مت کی مختلف شکلیں زمین کے بظاہر بکھرے ہوئے خطوں-شمالی امریکہ کے انڈین قبائل سے افریقہ کے باشندوں تک، انڈیا کے دراوڑوں اور آسٹریلیا کے قبیلوں میں پائی جاتی ہیں۔ طوطم نے مذہبی معروض کے طور پر قبیلے کو متحد کرنے میں مدد کی۔ قبیلے کے افراد نے اس کے ذریعے

خود کو مربوط سمجھا۔ ایروقیوں نے نیم ڈارونی انداز، میں یہ سمجھا کہ وہ شروع شروع میں عورت کے ریچھ بھیڑیئے اور ہرن کے ساتھ جنسی عمل کرنے وجود میں آئے۔ طوطم ایک معروض یاعلامت کے طور پر غیر متمدن لوگوں کے لئے تعلقات اور امتیاز کی مفید نشانی بن گیا۔ دُنیاداری کے معاملات میں یہ نیک شگون یا نمائندہ تصویر بن گیا اور برادرانہ تعلقات میں شیر، عقاب، بارہ سنگھا اور ہرن نے قوموں کی نمائندگی کی۔ ہاتھیوں کے سے گونگے بے حرکت اڑیل جانور جھگڑالوپن میں ہماری سیاسی جماعتوں کی نمائندگی کے لئے استعمال ہوتے ہیں، آغاز عیسائیت میں فاختہ، مچھلی اور بھیڑ طوطم پوجا کی یادگاریں تھیں۔ یہاں تک کہ قبل از تاریخ یہودیوں میں ادنی درجے کا سور بھی ایک طوطم تھا۔ بعض معاملات میں طوطم جانور مانع شے تھا یعنی اسے چھونا منع تھا لیکن مذہبی رسم کی ادائیگی کے طور پر اسے کھایا جاسکتا تھا جس کا مطلب مذہبی طور پر کسی دیوتا کا کھانا تھا۔ حبشہ کے گیلاس بڑی عقیدت کے ساتھ تہوار کے طور پر اُس مچھلی کو کھاتے جس کی وہ پوجا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا"جب ہم اسے کھاتے ہیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کی روح بھی ہمارے اندر حرکت کررہی ہے"۔ جو مشنری گیلاس کے باشندوں میں عیسائیت کی تبلیغ کرتے وہ ان سادہ لوگوں میں مذہبی رسم کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے جو عیسائیوں کے گرجا میں حضرت عیسیٰ کی بنیادی رسم منشائے ربانی سے بہت ملتی تھی۔"[۱]

قدیم مصر میں بادشاہوں کے بغیر مذہب، اخلاق اور زندگی کا فلسفہ سمجھنا مشکل تھا۔ بادشاہوں کے اندر دیوتاؤں کی روح دیکھی سمجھی جاتی تھی۔ قدیم مصر میں آٹھ دیوتاؤں والا تصور طاقت پکڑ گیا تھا۔ مصر کے لوگ کہتے تھے کہ یہ دنیا آٹھ دیوتاؤں نے مل کے بنائی ہوئی ہے۔ مصری تہذیب میں لوگ اپنی زندگی طوطم (تصورات) کی صورت گزار دیتے تھے۔ مذہبی عقیدوں میں سب سے بڑا سوال سب سے اہم عقیدہ ایک خدا یعنی کائنات کی تخلیق کامالک ہے۔ بودھ مذہب اور جین مذہب دونوں اس کائنات کے مالک خدا کو نہیں سمجھتے اور نہ کسی بھی خدا کی عبادت کرتے ہیں۔

مغرب میں سائنسی ترقی سے وجود میں آنے والی تہذیب نے جہاں انسان کو بہت سے فوائد پہنچائے وہیں سائنس کی ایجادات سے وجود میں آنے والے صنعتی معاشرے نے ہر طبقہ مڈل کلاس پیدا ہوا۔ ہر آتے وقت کے ساتھ انسانوں کے درمیان موجود طبقاتی تفریق زیادہ سے زیادہ ہوتی گئی اور امیر امیر سے امیر تر اور غریب غریب

سے غریب تر ہوتا گیا۔ نئے معاشی نظام کو سرمایہ دارنہ نظام کہا جانے لگا۔ اور یہ نظام طبقاتی تفریق پر مبنی نظام ہے۔ جس میں آزاد تجارت کے اصولوں کے تحت کوئی بھی صاحب سرمایہ اپنی دولت کی بنیاد پر دولت حاصل کر سکتا ہے اور محنت کرنے والا صرف اپنے اوقات کے پیسے لیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف مختلف مفکرین سامنے آئے جن میں سب سے اہم نام مارکس کا ہے۔ مارکس نے ایک غیر طبقاتی معاشرے کا تصور پیش کرتے ہوئے اپنے نظریے پر عمل کرنے کے طریقے کو کمیونزم کا نام دیا۔ مارکس کے بعد آنے والے کمیونسٹوں نے اپنے نظام زندگی سے مذہب کو نہ صرف دیس نکالا دے دیا بلکہ مذہب کی ظاہری رسومات پر بھی پابندیاں عائد کیں۔ برصغیر پاک وہند میں ترقی پسند تحریک ادب میں مارکسزم کی نمائندہ تحریک تھی۔ اس تحریک کے ایک ظ انصاری تھے۔ کمیونزم بارے میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے:

> "انسان ایک مشترکہ خاندان کی طرح زندگی بسر کریں۔ یہ معیار کوئی چھوٹا یا معمولی معیار نہیں ہے۔ دُنیا کے سب بڑے بڑے مذاہب یہی معیار ہمارے سامنے رکھتے آئے ہیں۔ ہندو دھرم کا کہنا ہے کہ۔ "دُنیا کے سب انسان ایک کنبہ ہیں۔" قرآن میں لکھا ہے۔ "اور تمام انسان ایک واحد قوم کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔" اسی طرح کی تعلیم ہمیں دُنیا کے سب مذہبوں میں ملتی ہے۔ کمیونزم انسانی مساوات کا علم بردار ہے۔ اس کا ایک خاص اصول ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسان کی محنت سے بے جا فائدہ نہ اُٹھائے، سب اپنی محنت سے کھائیں اور دنیا کے سیاسی انتظام کی باگ ڈور محنت کش لوگوں کے ہی ہاتھوں میں رہے۔ کمیونزم عورتوں کو بھی مردوں کے برابر کا درجہ دیتا ہے۔ اخلاق پر اس کا خاص زور ہے۔ چین میں زندگی کے تین سب سے بڑے اصول "ایمان داری، سادگی اور خدمتِ خلق" مانے جاتے ہیں۔ روس میں وہاں کے نیتا خروشچیوف نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ: "ہم کسی مذہب کو مانیں یا نہ مانیں ہم نے آج تک کسی کے ساتھ بھی اپنے عہد وپیمان کو نہیں توڑا اور نہ ہم کسی کو زبان دے کر اس سے پیچھے ہٹنا اپنے لئے روا سمجھتے ہیں۔" روس کے سب سے بڑے اخبار کا نام "پراوَدا" ہے۔ پراوَدا کے لفظی معنی "سچائی" ہیں۔ شمالی روس کی ہزاروں برس کی پرانی جنگلی قوم اسکیمو کو تعلیم وتربیت دے کر دنیا کی مہذب سے مہذب قوموں کے برابر میں لا کر کھڑا کر دینے کا سہرا کیمو روس ہی کے سر بندھ سکا۔"[11]

انصاری کے مندرجہ بالا بیان کے مطابق کمیونزم کا ایک رُخ سامنے آتا ہے۔ جب کہ روس میں اشتراکی حکومت نے مذہب اور اہل مذہب کے ساتھ کیا رویہ اپنایا اور لامذہب معاشرے کی تشکیل کس طرح کی یہ ایک الگ موضوع ہے مگر اس کی طرف یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ کمیونزم کے بعد دُنیا بھر کے طرزِ عمل اور معاشی تصورات کو کمیونزم نے کلی یا جزوی طور پر متاثر کیا اور ایک نئی ثقافت کی تشکیل کی۔

ہ۔ معاشرتی نظام اور عادات:

معاشرتی مطالعے سے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے انسان کے قائم کردہ مختلف اداروں سے بحث ہوتی ہے۔ معاشرتی مسائل قدیم تہذیب کے وقت سے ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ہر معاشرے میں مختلف رسوم رواج بھی ہوتے ہیں۔ معاشرتی مطالعے کے دوران ہم معاشرے میں آبادی، غذا، تعلیم، صحت اور اس کے رسم ورواج عادات کے بارے میں معلوم کرتے ہیں۔ معاشرے میں معاشرتی اداروں کا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ وہ معاشرے میں پیدا ہونے والے معاشرتی مسائل کو دیکھتے ہیں اور انھیں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انسان دُنیا میں دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرتا ہے اور کسی مخصوص خاندان کا ایک فرد ہوتا ہے اس خاندان اور اس کے دوسرے ارکان کے ساتھ اس کے کچھ نہ کچھ تعلقات ہوتے ہیں ان کے تعلقات کے سلسلے میں مختلف قسم کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے کا قدیم معاشرتی نظام ایک باضابطہ اور مکمل نظام ہوتا ہے۔ یہ مکمل نظام اُس وقت پوری طرح سے سمجھ میں آتا ہے جب معاشرے میں اس کے مختلف اجزا کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جس سے اس کے فوائد اور نقصانات کا پتا چلتا ہے۔

معاشرے میں دیہات کو قدیم زمانہ ہی سے معیشت کی اکائی کی حیثیت حاصل ہے۔ دیہاتی علاقے رقبے کے اعتبار سے کہیں بڑے اور کہیں چھوٹے میدانی علاقوں یا پہاڑی علاقوں پر پھیلے ہوتے ہیں۔ دیہات کا قانون معاشرتی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ دیہات میں رہنے والوں پر ان قوانین کی پابندی اخلاقاً لازمی ہوتی ہے۔ قانون کی خلاف ورزی سے یا اس کی مخالفت کی قطعی اجازت نہیں ہوتی۔ اس معاشرے میں زراعت کا پیشہ مقدس سمجھا جاتا ہے۔ قدیم دور میں زراعت پر ہی انحصار کیا جاتا تھا۔ دیہات میں بڑھئی، لوہار، درزی، تاجر اور دوسرے پیشے اپنائے جاتے تھے لیکن ان کی گزر بسر کا دارومدار زراعت پر تھا۔ کاشتکاروں کو کاشت کے دوران اگر ان کی مدد درکار ہوتی تو اس میں سے ہر ایک کو معمول کے مطابق اناج مل جاتا۔ قدیم دور میں دیہات کا نظام خود کفیل ہوتا تھا۔ ہر پیشے کا فرد اپنا کام اچھے طریقے سے کرتا اور ایک دوسرے کی مدد بھی کرتا تھا۔ دیہات گاؤں میں

مویشی چرانے کا رواج بھی عام تھا اسی طرح جنگلات کی لکڑیوں کا استعمال میں لانا مشترکہ طور پر ہوتا تھا۔ ان دیہاتوں میں عدل وانصاف کے لیے پنچایت کا نظام تھا اور ان میں معاشرتی حوالے سے مسائل کو حل کیا جاتا تھا۔ ایک کمیٹی بنادی جاتی جو لوگوں کے مسائل کو سنتی اور انھیں حل کرنے کی کوشش کرتی۔

رسم ورواج کو معاشرتی زندگی میں قدیم زمانے ہی سے اہمیت حاصل ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی خصوصیت بھی یہی ہے کہ یہاں صنعتی ممالک کے مقابلے میں رسم ورواج کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ معاشرے میں رہنے والے لوگوں کو رسم ورواج میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ قدیمی روایات کو زندہ رکھتے ہیں۔

کم سنی شادی کی رسومات معاشرتی اعتبار سے دیکھا جائے تو قدیم دور میں کچھ قبائل کم سنی بچیوں کی شادی کر دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ لڑکی خاندان کے لیے رسوائی کا باعث بن سکتی ہے۔ اور جلدی شادی کرنے سے معاشرے میں اخلاقی خرابیاں پیدا نہیں ہوتیں۔ لڑکی کو وقت سے پہلے زندگی کی اہم ذمہ داریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ اولاد ہونے کی صورت میں کم سن لڑکی اپنی اولاد کی دیکھ بھال کرنے سے قاصر ہوتی بچوں کے ساتھ ساتھ ما ں کی صحت پر بھی بُرا اثر پڑتا۔

رسوم ورواج میں ازدواجِ بیوگان کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے کہ کسی معاشرے میں بیوہ کو شادی کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا اور اس کو منحوس قرار دیا جاتا ہے۔ اسے کوئی خاندان بھی قبول نہیں کرتا ہے۔ ہندوستان میں قدیم دور سے لے کر آج بھی بیوگان کو دوسری شادی کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کو دینِ اسلام نے اس چیز کی اجازت دے رکھی ہے۔ شادی بیاہ اور دوسری تقاریب کے موقع پر اپنی حیثیت سے زیادہ اخراجات کرنا اور رسومات میں زیادہ اسراف سے کام لینا اور لڑکی والوں سے جہیز طلب کرنا وغیرہ معاشرتی مسائل اور رسومات میں شامل ہیں۔ حسن دین احمد معاشرتی عادات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''کسی ملک کے معاشرتی حالات کا پورا اندازہ کرنے کے لیے نہ صرف وہاں کے اہم معاشرتی اداروں کا مطالعہ کافی ہوتا ہے بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس ملک میں تعلیم کی کیا حالت ہے ؟ وہاں کے باشندوں کی صحت کا معیار کیا ہے ؟ اور وہاں کے لوگوں کا معیار رہائش کیا ہے ؟''[۱۲]

معاشرتی حالات اس وقت تک بہتر نہیں ہو سکتے جب تک معاشرے کے افراد تعلیم اور ادب کی دولت سے مالا مال نہ ہوں۔ ادب نے ہی انسانی رشتوں کو استوار رکھا ہے۔ ادب زندگی کی ترجمانی کرتا ہے اس سے ثابت

ہوتا ہے کہ ادب تہذیب میں معاشرتی حالات کی بہتری کی طرف گامزن ہونے کا ایک بہترین نمونہ ہے۔انسان ایک سماج کا فرد ہے؛انسانی زندگی کے افعال ان کی محبت، نفرت، دولت، غربت، خوشیاں، دکھ درد، رسومات، عادات ان کی ترقی، پستی بلکہ ہر چیز کے بارے میں اس کی دلچسپی موجود ہوتی ہے۔انسان ہی معاشرے کی تشکیل کرتا ہے اور ایسے ادب کی تخلیق کرتا ہے جس سے زندگی کے بارے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔معاشرے کے افراد داخلی طور پر زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنے اندر تبدیلی محسوس کرتے ہوئے تجربات سے گزرتا ہے۔ان تجربات سے وہ کسی فائدے یا نقصان کے حوالے سے پہچان رکھنے لگتا ہے۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> "ادب بھی بنیادی طور پر ایک سماجی عمل ہے اور ہمیشہ سے ایک سماجی عمل رہا ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ سماجی عمل ادب کے وجود میں، اس کے مزاج میں، اس کے خون میں شامل ہے اور یہی اس کا پہلا بنیادی رشتہ ہے۔اسی رشتے کی وجہ سے ادب انسان کے سماجی رشتوں کا سب سے اہم مظہر بن کر وقت کی روح کے اظہار کا سب سے بڑا وسیلہ بن جاتا ہے۔انسانی زندگی اور معاشرے میں چونکہ لفظ کی بنیادی اہمیت ہے اس لیے لفظ کے تعلق سے زبان کی اور زبان کے تعلق سے ادب کی بھی بنیادی اہمیت ہے۔وہ معاشرے جن کے ہاں اچھے اور صحت مند ادب کی تخلیق بند ہو جاتی ہے زوال پذیر ہو کر کسی دوسرے معاشرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔"[۱۳]

کسی بھی معاشرے کی تشکیل، اس کی ثقافت اور اس کے تہذیب و تمدن کے لیے ادب، مذہب، معاشی و اقتصادی ڈھانچوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ایسے ہی کچھ وجوہات ایسی ہیں جن کی وجہ سے معاشرہ شکست و ریخت کا شکار ہوتا ہے۔قدیم معاشرے کے رسم و رواج پر طنز کرتے ہوئے ول ڈیورانٹ کا کہنا ہے:

> "جدید انسان کی نسبت ،وحشی، کی روح میں معاشرتی جذبات پیدا کرنا مقابلتاً آسان تھا۔جہدِ حیات سے اشتراکیت کا ظہور ہوا جب کہ ملکیت کی جدوجہد نے انفرایت کی راہ ہموار کی۔غالباً غیر متمد انسان ہم عصر انسان کے مقابلے میں اپنے ساتھیوں کی مدد کے لئے زیادہ آمادہ رہتا تھا،اس میں سماجی یگانگت زیادہ پیدا ہوئی کیونکہ اسے زیادہ خطرات کا سامنا تھا اور اس کے اس کے ساتھ زیادہ مفادات وابستہ تھے۔اُس کے پاس ملکیت کم تھی جو اُسے دوسرے ساتھیوں سے جدا کرتی ،فطری انسان زورآور اور لالچی تھا، لیکن وہ مہربان اور

فیاض بھی تھا۔ اجنبیوں کے ساتھ شراکت پر اور مہمانوں کو تحفے دینے میں خوشی محسوس کرتا۔ یہاں تک کہ سکول کا طالب علم بھی جانتا ہے کہ بہت سے غیر متمدن قبیلوں میں مہمان نوازی اس انتہا پر تھی کہ میزبان اپنے مہمان کو بیوی یا بیٹی پیش کر دیتا تھا۔ ایسی پیش کش کو ٹھکرانا نہ صرف میزبان بلکہ اس عورت کی بھی ہتک شمار ہوتی۔ مشنریوں کو ایسے ہی ناخوشگوار حالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ عورت کو مسترد کرنے کا عمل اس انداز سے متعین ہوتا تھا جس کے مطابق مہمان سونپی گئی ذمہ داری سے عہدہ بر آ ہوتا تھا۔ غیر متمدن انسان جنسی حسد کے ساتھ نہیں بلکہ ملکیت کے تصور کے ساتھ جیتا تھا۔ اُسے یہ بات پریشان نہیں کرتی تھی کہ اُس کے پاس آنے سے پہلے اس کی بیوی کے دوسروں کے ساتھ کس قسم کے تعلقات تھے یا اب وہ اس کے مہمان کے پاس سوئی ہوئی ہے وہ اس کا مالک تھا نہ کہ عاشق۔ اُسے جو چیز پریشان کرتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اس کی مرضی کے بغیر یا اپنی مرضی سے کسی اور انسان کے پاس نہیں رہ سکتی تھی۔ بعض افریقی خاوند اجنبیوں کو کچھ رقم یا اشیا کے بدلے اپنی بیویاں اُدھار دے دیتے۔"[۱۴]

معاشرے میں اچھی بری عادات کے لوگ ہوتے ہیں۔ لوگوں کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے غذا، لباس اور رہن سہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ لوگ محنت مزدوری کر کے اپنے گھرانے کو درست سمت میں رکھتے ہیں اور کچھ لوگ بری عادات کے مالک ہوتے ہیں جن کا مقصد دوسروں کو تکلیف دے کر اپنا سکھ تلاش کرنا ہوتا ہے۔ تہذیب کو نکھارنے کے لیے اچھی عادات کا ہونا بہت ضروری ہے۔ معاشرے کی اصلاح کے لئے بے تاب و بے چین ہونا بہت ضروری ہے۔ جوان، بچے، بوڑھے سب اس معاشرے کے اجزا کی صورت ہیں۔ معاشرے میں عدل و انصاف اخوت اور بھائی چارگی کا ہونا بہت ضروری ہے تاکہ معاشرتی اعتبار سے تہذیب اپنا مقام بلند رکھ سکے۔ ایک ایسا ماحول جس میں محبت کا جذبہ اور ایک دوسرے سے انصاف اتحاد کا ماحول ہو۔ دُکھ درد بانٹنے کے راستے کھلے ہوں اور اگر معاشرے میں اچھائیوں کا فقدان ہو برائیاں ہر طرف ہوں تو معاشرے کا مستقبل اندھیرے میں ہو گا۔ انسان کا انسان سے ہی نہیں بلکہ جانوروں سے بھی پیار کرنا ضروری ہے۔ ایک منظم معاشرے کی ضرورت ہر تہذیب کو ہوتی ہے۔ عورت کا احترام پہلا قدم ہوتا ہے جس معاشرے میں عورت کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے وہ معاشرہ بہتر سمت کی طرف گامزن رہتا ہے۔ وہ قومیں برباد ہو جاتی ہیں جو انسانیت کو بالائے طاق رکھتی ہیں۔ معاشرے میں معاشیات اور سیاسیات کے نظام پر ول ڈیورانٹ کا کہنا ہے:

> "بہت کم معاشروں نے اپنے اخلاقی ضابطے کی بنیاد معاشی اور سیاسی افادے پر رکھی۔ کیونکہ فرد کو فطرت کی طرف سے ایسا مزاج نہیں ملا کہ اپنی شخصی دلچسپیاں گروہ کے مفادات کے ماتحت کردے یا پریشان کُن ضابطوں کی پابندی کرے جن کے نفاذ کے لئے ٹھوس ذرائع نہ ہوں۔ معاشی محرکات کو انفرادی محرکات کے مقابلے میں مضبوط کرنے کے لئے ایک غیر مرئی نگہبان کو مقرر کر کے معاشروں نے مذہب کو ایجاد نہیں کیا بلکہ اس کا استعمال کیا ہے۔ انیس سو سال پہلے قدیم زمانے کے ماہر جغرافیہ دان نے اس موضوع پر بہت اعلیٰ خیالات پیش کیے۔"[۱۵]

تاریخ بتاتی ہے مختلف قومیں مختلف گروہوں کے ملاپ سے منظر عام پر آئیں۔ مگر قومیں فطری، معاشی اور معاشرتی حوالے سے تقسیم ہوتی رہیں۔ اس صورتِ حال میں ضروری تھا کہ مختلف گروہوں کی شکل میں حقوق و فرائض عدل و انصاف کے اقدام کیے جاتے۔ مگر یہاں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کا نقصان مشرقی پاکستان کا علیٰحدہ ہونا ہے۔ ایک بہترین مضبوط قوم اور اچھا معاشرہ اس وقت تک وجود میں نہیں آتا جب تک معاشرے کے افراد بغیر کسی خارجی دباؤ کے اپنے داخلی معاملات کی نشاہدہی کریں اور اپنے معاشرتی حالات کی بہتری کے لیے افراد مل کر کام کریں اور ہر قسم کی خارجی مداخلت کو روک دیں۔ قومیں جب تک اپنے سامنے انفرادی اور اجتماعی حوالے سے کوئی مقصد اپنے سامنے نہیں رکھیں گے اس وقت تک مسائل بڑھتے رہیں گے۔ کچھ دوسری اقوام ایسی بھی ہیں جو اپنے معاشرتی معاملات قوم پرستی اور وطن کی محبت کے جذبے سے تمام مسائل کا حل سوچتی ہیں۔ اُن کی تاریخ، زبان، ثقافت اور تہذیب ایک ہوتی ہے۔ انفرادی حیثیت کا بھرپور فائدہ حاصل کرتی ہیں۔ اپنی بقا تحفظ اور فروغ کے لیے قربانیاں دینے سے گریز نہیں کرتی ہیں۔ جن قوموں میں بنیادی فیصلے حل کرنے کی سکت نہیں ہوتی اپنی انفرادی حیثیت تک کھو دیتی ہیں۔ وہ قومیں کبھی کامیاب نہیں ہوتی کیونکہ وہ دوسروں قوموں پر انحصار کرنے لگتی ہیں۔ آئرلینڈ کے ایک رہنما ولیم ڈراگن نے کہا تھا کہ ہماری قوم کی آزادی خود ہم پر منحصر ہے۔ اگر ہم مستقل مزاجی سے اپنی صلاحیتیں ٹھیک طرح کام میں لائیں گے تو جلد ہم خوشحالی اور آزادی کی نعمت پاسکتے ہیں۔

معاشرے کے افراد موجودہ ترقی پچھلی نسلوں کے مسلسل کام کرتے رہنے سے حاصل کرتے ہیں۔ جو نسل کام کر چکی ہوتی ہے وہ اگلی نسل میں منتقل ہو جاتی ہے اور اگلی نسل اپنی کوششوں سے آگے بڑھاتی ہے تب جا کر کہیں تہذیب بنتی ہے اور یہ تہذیب اگلی نسلوں میں منتقل ہوتی ہے۔ قوم افراد سے مل کر بنتی ہے۔ جس قوم کے

افراد میں اخلاق کے یہ اعلیٰ اوصاف اور کردار کی یہ خوبیاں پائی جائیں گی اسی قدر وہ قوم معزز، محترم اور مضبوط ہوگی۔ عمدہ اور اچھا معاشرہ اپنے عوام کی جان ومال اور ان کی آزادی کی حفاظت تو کرسکتی ہے مگر کسی شخص یا گروہ میں اصلاح یا ترقی کا جذبہ پیدا نہیں کرسکتی۔

و۔ سیاسی نظام:

معیشت، معنویت، جذبات و احساسات لوگوں سے ذاتی تعلقات کا ہنر انسانی سرگرمیوں میں آتا ہے۔ معاشرے میں مختلف سرگرمیاں پائی جاتی ہیں جنھیں انسان استعمال میں لاتا ہے۔ معاشرے میں سب سے اہم سیاست ہے۔ معاشرے میں ایک اہم کردار جو سامنے آتا ہے وہ حکومت ہے۔ سیاست کی معنویت سے اور حکومتی اخلاقیات سے ایک منظم معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اگر سیاسی نظام میں روحانیت، معنویت نہ ہو تو سیاسی ڈھانچہ قائم نہیں رہ سکتا۔ تہذیب کو بنانے میں سیاسی نظام کا بہترین ہونا ضروری ہے تنگ نظر، چھوٹی سوچ والے افراد معاشرے کو بنانے سے ہمیشہ قاصر رہتے ہیں۔ مسلمانوں کا سیاسی سفر مدینے سے شروع ہوا اور بدلتے وقت کے ساتھ انھوں حیرت انگیز کامیابیوں کے ساتھ منزلیں عبور کیں۔ آج ہزاروں سال گزرنے کے باوجود بھی ان کی علمی اور ثقافتی امور دورِ حاضر کی تہذیبوں میں پائی جاتی ہے۔ جس معاشرے میں سامراجیت، تسلط پسندی جارحیت کو فروغ دینے والی قوتیں موجود ہوں گی۔ اُس وقت سیاسی نظام اپنی اصل شکل میں نہیں سامنے آسکتا ہے۔ علم و دانش، تدبیر و تدبر، احساس ذمہ داری، فرض شناسی، خداشناسی، خدا پر توکل اور یقین کے ساتھ معاشرے کی ترقی کے امکانات روشن ہوجاتے ہیں۔ جو قوم معاشرے میں رہ کر اپنا دفاع نہیں کرسکتی ہے وہ عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں اور ترقیوں سے کچھ بھی حاصل نہیں کرسکتی بلکہ اپنے دفاع کے لیے دوسروں پر انحصار کرنا سب سے بڑی بے وقوفی ہے اس سے کوئی بھی معاشرہ ارتقا کے مراحل طے نہیں کرسکتا۔

کسی بھی ملک کے لوگ جب سیاسی اعتبار سے آزاد ہوتے ہیں تو وہ لوگ اپنی ذمہ داری کو سمجھتے ہیں اور اسے احسن طریقے سے سرانجام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح حکومت کرنے والے اپنے ملک کے عوام کے خدمت گار رہتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ اس کا سیاسی نظام بہترین ہو۔ سیاست کا تعلق ان علوم سے ہے جو انسان زندگی کے امور اور اس کے رفتہ رفتہ ترقی سے متعلق ہے انسان کی زندگی بہت وسیع ہے لیکن سیاست ایک بسیط چیز ہے اور اس کو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی سے تعلق جتنے بھی علوم

پائے جاتے ہیں اُن کی کوئی حد بندی نہیں ہوتی ہے۔ سیاسی نظام کا تعلق زندگی سے متعلق ہیں جیسے تاریخ، معاشیات اخلاقیات اور نفسیات وغیرہ۔ کسی بھی معاشرے کا سیاسی نظام اپنے اندر معاشرتی عمل دخل رکھتا ہے۔ اسی طرح سیاسیات کا رشتہ اخلاقیات سے گہرا ہے۔ معاشرے کی اقدار کا دارمدار فکر و تخیل پر ہوتا ہے جب کوئی ریاست سیاسی حوالے مضبوط ترین ہو جاتی ہے تو لوگ طرزِ زندگی کو سمجھنے لگتے ہیں۔ زندگی کے مسائل دھیرے دھیرے حل ہونا شروع ہو جاتے ہیں کیونکہ لوگوں کا معاشرتی اداروں سے رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ سیاسی نظام کو تین حصوں میں سمجھا جاسکتا ہے۔ پہلے حصے میں تاریخی اعتبار سے دیکھیں تو ہمیں اس میں فلاسفروں کے نظریات دورِ قدیم سے دورِ حاضر تک ملتے ہیں۔ دوسرے حصے میں نظری اصول بہت اہمیت کا حامل ہے اس کا تعلق اصولوں اور معیاروں کے معاملات پر ہوتا ہے۔ تیسرے حصے میں عملی اعتبار سے کسی خاص نظام کو لیا جاتا ہے۔ ریاستی اداروں اور معاشرے میں فرق یہ دیکھا جاتا ہے کہ ریاست میں کون سے ادارے ہیں جو ایک منظم طریقے سے حکومت بنا سکتے ہیں اور معاشرے کے اندر امن قائم کر سکیں۔ سیاسی نظام کی فضا کی طرف ول ڈیورانٹ اس طرح اشارہ کرتے ہیں:

> ”جہاں حکومت صرف گروہ کے خاندان کے سربراہ کی ہوتی تھی اور کوئی مطلق العنان مقتدرہ تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ ایروقیس اور دلاورے کے انڈینز (Iroquious and Delaware Indians) خاندان اور جتھے کے نظام کے علاوہ کسی قسم کے قوانین یا پابندیوں کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کے سرداروں کے پاس معمولی اختیارات ہوتے تھے۔ جسے کسی وقت بھی قبیلے کے بزرگ ختم کر سکتے تھے۔ سات افراد پر مشتمل کونسل اوماھا کے انڈینز پر حکمرانی کرتی تھی۔ جو غور فکر کے بعد کسی متفقہ سمجھتے تک پہنچ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ایروقیس کی مشہور لیگ تھی جس کے ذریعے بہت سارے قبیلے امن وامان قائم رکھنے کے لئے اپنے آپ کو ایک جگہ اکٹھا کر لیتے اور اپنے پیمان کو پورا کرتے۔ ان "غیر متمدن" لوگوں اور جدید مملکتوں کے درمیان زیادہ بڑا فاصلہ نظر نہیں آتا جو امن قائم کرنے کے لئے خود کو اقوامِ متحدہ کے ساتھ جوڑ لیتی ہیں۔ جنگ کی بدولت سردار، بادشاہ اور ریاست وجود میں آتے ہیں اور یہی جنگ کو پیدا کرتے ہیں۔ سموا میں جنگ کے دوران سردار بااختیار ہوتا تھا۔ لیکن دوسرے اوقات میں اُسے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ ڈیاکوں میں اپنے خاندان کے سربراہ کے علاوہ کسی حکومت نہیں ہوتی

تھی۔ جنگ کی صورت میں وہ اپنے سب سے بہادر جنگ جُو کو قیادت سونپتے۔ اُس کی سختی سے فرماں برداری کرتے لیکن جب جنگ ختم ہو جاتی تو اُسے فارغ کر دیتے امن کے دنوں میں پادری سب سے بڑا جادو گر زیادہ بااختیار اور بااثر ہوتا تھا۔ جب آخرِ کار عمومی حکومت کی شکل میں مستقل بادشاہت کا قیام ہوا تو اکثر قبیلوں میں یہ جنگجوؤں اور پادریوں سے وجود میں آئی۔ معاشروں پر دو قوتوں کی حکمرانی ہوتی ہے۔ امن میں الفاظ اور جنگ میں تلوار، قوت صرف اس وقت استعمال ہوتی ہے۔ جب ذہن کی صفائی کا عمل ناکام ہو جاتا ہے۔ قانون اور دیومالا صدیوں تک ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے ہیں یا تو یہ باہمی تعاون سے یا باری باری نسلِ انسانی کا انتظام سنبھالتے رہے ہیں۔ ہمارے اپنے عہد تک کوئی ریاست انہیں الگ نہیں کر سکی اور غالباً کل پھر وہ متحد ہو جائیں گے۔"[16]

سیاست اقتدار کے حصول میں کوشاں رہتی ہے۔ سیاست تدبیر، زیرکی، سازش، مسلح طاقت اور لوگوں کی رائے اور اجتماعی خواہشات کے تحت اپنے مقاصد کے حصول کی کوشش کرتی ہے۔ سیاست کی بنیاد اس اصول پر ہوتی ہے کہ معاشروں پر حکومت کے لیے نظام سیاست اور قوانین کو حالات و ماحول کے تحت تبدیل ہوتے رہنا چاہیے تاکہ انسانی معاشرہ ایک جگہ ٹھہرنے کے بجائے حرکت پذیر رہے۔ اسلامی معاشرے اوراسلامی ریاست میں ہر شخص اللہ کا غلام اور انسانیت کا خادم تصور کیا جاتا ہے۔ اس سیاسی نظام میں نسل ورنگ کا امتیاز نہیں ہوتا۔ سب کی ضروریات بیت المال سے پوری کی جاتی ہیں۔ عام شخص کو بھی نظام حکومت پر تعمیری تنقید کی اجازت حاصل ہوتی ہے۔ قانون کی پاس ہوتی ہے امیر غریب اور شاہ گدا یکساں ہوتے ہیں۔ عریانی اور فحاشی کی اجازت نہیں دی جاتی اور انسانیت کی بنا علم پہ رکھی جاتی ہے۔

اقتدار میں سیاسی کوششوں کے دوران اخلاقیات کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ان اخلاقیات کے اہم عوامل تہذیب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انصاف، مکالمہ، مشورہ، تنقید کرنا اور تنقید برائے اصلاح سمجھ کر برداشت کرنا، سازشوں سے دور رہنا، غلط دعوؤں سے بچنا، معاشرے کے افراد کو غلط بیانی کے ذریعے گمراہ نہ کرنا، معاشرے کی بقا کے لیے ہر وقت مثبت سوچ کے ساتھ ملک و قوم کی بھلائی کا سوچنا تہذیب میں سیاسی عوامل کی اہم اقدار ہیں۔ اگر ان اخلاقیات سے ہٹ کر سیاسی اقدام کیے جائیں گے تو اس کا حاصل ملک و قوم کی بربادی ہی ہے۔ یہ اخلاقیات اسلامی تعلیمات کے علاوہ تمام دوسرے مذاہب میں بھی شامل ہیں یعنی ہم کہہ سکتے ہیں یہ

اخلاقیات عالمی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہر معاشرے کی تہذیب کے لیے یہ اخلاقیات انتہائی ضروری ہیں۔ اب دستوری ریاست کے حوالے سے دیکھتے ہیں کہ سیاسی نظام میں دستوری ریاست کس طرح انسانیت کے بنیادی حقوق کو دیکھتی ہے۔ ریحان عزیز اپنے آرٹیکل معاشرہ اور سرمایہ داری میں دستوری ریاست کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”دستوری ریاست کو سمجھنے کے لیے ہم ابتدا اس بنیادی سوال سے کرتے ہیں کہ یہ ہے کیا؟ دستوری ریاست وہ ریاست ہوتی ہے جو بنیادی انسانی حقوق کا اقرار کرتی ہے اور اس کی پاس داری کا حلف اٹھاتی ہے اور دستور سے مراد اس کتاب فطرت سے آگاہی ہے جس کی ابتدائی شناخت دور تنویر میں ہوئی اور یہ سمجھ لیا گیا کہ انسان کی اصل حقیقت اس کی زندگی کا مقصد اور اس کی اصل ”خواہش“ ہے۔ سیاسیات کا ایک عام طالب علم اس سے واقف ہے کہ دنیا کا پہلا دستور امریکہ میں وجود میں آیا اور اس کے مرتب کرنے والے اس دعویٰ کو بجا سمجھتے تھے کہ امریکی دستور کتاب فطرت پر مبنی ہے اور اسی بنا پر تمام دنیا کو امریکا اور اس کے مفکرین کی آرا کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہیے۔ دراصل بات یہ ہے کہ دستور نے جس چیز کی جگہ لی وہ کچھ اور نہیں بلکہ کتاب الٰہی یا قوانین الٰہی ہیں۔ تاریخی طور پر عیسائیت کو ابتداً جس طور پر رد کیا گیا وہ مذہب کا رد یا عیسائیت کے تصور خدا کا رد نہ تھا بلکہ جس چیز کا بنیادی طور پر رد کیا وہ کتاب کا رد تھا اور اس بات کا رد تھا کہ کلیسا کو اس تعبیر کا کلی حق حاصل ہے۔ جدیدیت نے ابتدا میں اس بات کا رد نہیں کیا کہ خدا کی مرضی ہی اصل الاصول ہے یہی وجہ ہے کہ جب جان لاک نے عوام کی حکمرانی کے نظریے کا جواز پیش کیا تو وہ خدا کی مرضی کے اصول ہی کی بنیاد پر کیا۔ اس نے کہا کہ عوام کی حکمرانی اس لیے ہونی چاہیے کہ خدا کی مرضی یہی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جان لاک کو اس مرضی کا علم کیونکر ہوا؟ تو جواب یہ ہے کہ اس علم کا منبع ایک نئی دریافت شدہ کتاب یا حقیقت ہے جسے کتاب فطرت کہا جاتا ہے۔ اس کتاب تک رسائی عقل کے ذریعے ممکن ہے پہلے چونکہ کلیسا کی وجہ سے گمراہی و جہل کے پردے پڑے تھے لیکن اب صحیح طور پر اس کتاب کا مطالعہ ممکن ہے اور امریکی دستور کے مصنفین وہ ہستیاں تھیں جو اسے ٹھیک ٹھیک پڑھ سکتی تھیں' اس بنیاد پر انہوں نے دستور کی فوقیت کا دعویٰ کیا۔ یہ بات اچھی طریقہ سے سمجھ لینا چاہیے کہ دستور کے مرتب کرنے میں کسی بھی طرح سے کتاب الٰہی کو سند نہیں سمجھنا چاہئے اور دوسری غلط

فہمی جس کا ازالہ ضروری ہے وہ یہ کہ دستور بنانے کے لیے عوام وغیرہ کی مرضی کی ضرورت نہیں ہوا کرتی ہے اور نہ ہی ابتدائی دستور سازوں نے اس قسم کا کوئی دعویٰ کیا تھا مزید یہ کہ اب دنیا میں جس قدر بھی دستور سازی ہوتی ہے اس کی بنیاد وہی دستور اول اور انسانی حقوق کا چارٹر ہے جس کی توثیق کے بغیر اس کا کوئی پہلو وجود میں نہیں آسکتا۔ دستور کا مقصد عوام کی اصل مرضی اور خواہش کا اظہار ہے اور یہ مرضی ریاست میں مختلف طور پر منعکس ہوتی ہے۔ مقننہ 'انتظامیہ اور عدلیہ مساوی طور پر عوام کی مرضی کی نمائندہ ہیں۔ اب سلسلہ یہ ہے کہ دستور ایک طرف تو مقننہ کے اثبات کے ذریعے اکثریت کے حق حکمرانی کو بالکلیہ طور پر تسلیم کرتا ہے تو دوسری طرف تقسیم اختیارات کے تحت مقننہ پر قدغن عائد کرکے یہ بتاتا ہے کہ اکثریت کی حکمرانی کا حقیقی مطلب کیا ہے۔ یہ بات اچھے طریقے سے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ایک جمہوری دستوری ریاست میں اکثریت کی حکمرانی کا مطلب یہ ہے کہ قوت نافذہ اور قانون کی تعبیر و تنفیذ کا کام اس اقلیت کے ہاتھ میں رہے جو ریاست کو سرمایہ داری کے اوصاف سے متمتع کردے، جو وسائل میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرے۔ بڑھوتری برائے بڑھوتری کے عمل میں طاق ہو۔ اصولی طور پر حکمرانی اکثریت کی ہی ہے لیکن اکثریت کی حکمرانی کا تقاضا ہے کہ ایسی اقلیت کی حکمرانی ہو جو وسائل میں اضافہ کی اہل ہو، یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں بھی جمہوریت مستحکم ہوتی ہے وہاں بیوروکریسی اور ٹیکنوکریسی کی حکومت مستحکم ہوتی ہے اور لوگوں کا کام محض اس اقلیت کی حکمرانی پر صاد کرنا رہ جاتا ہے۔ یہی جمہوریت ہے اور بیسیویں صدی میں سرمایہ داری اور اس کی عقلیت کو رائج کرنے کا سب سے معروف ذریعہ بھی یہی ہے۔ جو لوگ جمہوری ریاست کے حوالے سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جمہوریت عوام کی مرضی اور ان کی حقیقی آزادی کو ممکن بناتی ہے تو درست یہ ہے کہ انسان کو خدائے بزرگ و برتر کی جانب سے فقط یہ اختیار ملا ہے کہ وہ چاہے تو اللہ کی بندگی اختیار کرے اور چاہے تو شیطان کی بندگی اختیار کرے لیکن اللہ نے انسان کو یہ اختیار نہیں دیا ہے کہ بندگی سے نکل کر مطلق آزادی حاصل کرے۔ لہٰذا یہ واضح ہوا کہ جمہوریت کا مطلب آزادی مطلق نہیں ہے بلکہ اس بات کی آزادی ہے کہ سرمایہ کی گردش اور بڑھوتری برائے بڑھوتری کے عمل پر کوئی قدغن نہ ہو اور تمام اعمال اور اداروں اور اقدار کو اسی بنیاد پر جانچا جائے جو لوگ اس میں معاونت

کریں وہ انسان اور مہذب انسان ہیں اور جو اس کے دشمن ہوں انہیں تہس نہس کر دیا جائے۔ یہی آزادی ہے یہی دستور ہے اور یہی جمہوریت اور حقوق انسانی ہیں۔"[17]

عوام کی منشا اور ضروریات کا اظہار اصل میں دستور سازی ہے اور یہی راستہ ایک بہترین سیاسی نظام کے لیے ہوتا ہے۔ انتظامیہ اور قانون یعنی عدلیہ عوام کے رہنما ہوتے ہیں۔ عوام اپنے حقوق کے لیے اپنے نمائندوں سے رجوع کرتے ہیں۔ ول ڈیورانٹ نے اس حوالے سے لکھا:

"مستقل سماجی تنظیم کی سب سے ابتدائی شکل ایک جتھا تھا۔ رشتہ دار خاندانوں کا ایک گروہ جو مشترکہ زمین کے ایک ٹکڑے پر قابض تھا، جس کا ایک ہی ٹوٹم (Totem) اور ایک جیسے رواج و قوانین تھے۔ جب جتھوں کا ایک گروہ آپس میں ایک سردار کے ماتحت اکٹھا ہوتا تو ایک قبیلہ وجود میں آتا جو سٹیٹ کی راہ میں دوسرا قدم ہوتا۔ لیکن یہ ایک سُست رفتار ارتقا تھا۔ کئی گروہوں کا کوئی سردار نہیں تھا اور بہت سارے گروہ اپنے سردار کو صرف جنگ کے وقت برداشت کرتے۔ جمہوریت جو ہمارے عہد میں ایک زوال پذیر نظام ہے۔ غیر متمدن قبائل میں بہترین شکل میں پائی جاتی تھی۔"[18]

سماجی صورتوں میں انسان کے حالات کچھ اس طرح تھے کہ شکار کی صورت میں یا کسی مشکل حالات میں وہ سیاسی تنظیم قائم کر لیتے تھے۔ مختلف سماجی تنظیموں کے ساتھ مل کر سیاسی عمل میں اپنا کردار ادا کرتے تھے۔ سماج اور سیاست کا عمل خاندان، ملکیت اور ریاست کے تصورات مضبوط کرنے کے لیے نئے ذرائع پیدوار کی تلاش جاری رکھتے۔ سیاست اور سماج کا تعلق الگ تصور نہیں کیا جاسکتا۔ تہذیبی اعتبار سے دیکھیں تو کسی بھی دور میں ان مین کوئی حقیقی افتراق نہیں تھا۔

انسان نے اپنی زندگی کو بہتر گزارنے کے لیے تہذیب کے ادارے قائم کیے جسے ریاست کا نام دیا جاتا ہے اور اسی ریاست میں معاشرے کے لوگ باقاعدہ طور حکومت کی شکل میں اپنے اجتماعی نظام قائم کر کے اپنے معاملاتِ زندگی طے کرنے کے لیے ایک ضابطۂ ہدایت واخلاق پیش کرتے ہیں۔ انسان جب دوسروں سے تعلقات استوار قائم کرتا ہے تو تمام معاملات کی ضابطہ بندی کے لیے قانون کو نافذ کرنے لیے کچھ اداروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان اداروں میں معاشرتی، سماجی اور معاشی معاملات کی استواری کے لیے اقدام کیے جاتے ہیں۔ سیاسی نظام میں چند خصوصیات پر ریاست قائم کی جائے تو معاشرہ نکھر کے سامنے آتا ہے۔ ول ڈیورانٹ کے مطابق:

"ہیگل کے فلسفے میں اس تصور پر شرح وبسط کے ساتھ بحث کی گئی ہے کہ ریاست فرد کی حقیقی شخصیت کی ضامن اور ایک معنی میں اس کی خالق ہوتی ہے۔اس کی رائے میں وہ آزادی جو افراد کو معاشرے کے ارکان کی حیثیت سے حاصل ہوتی ہے،اُس آزادی کے مقابلے میں زیادہ حقیقی ہوتی ہے جو اُن کو معاشرے میں داخل ہونے سے قبل فرضی اور لا قانونی فطری حالت میں میسر تھی۔اور یہ آزادی جو صرف معاشرے میں ممکن الحصول ہے۔آزادی کے اُس بلند ترین تصور کا خارجی مظہر ہوتی ہے جو ہر فرد کے دل کی پہنائیوں میں پایا جاتا ہے اور جو بصورت دیگر معاشرہ کی غیر موجودگی میں بروئے کار آنے سے محروم رہتا۔ ہیگل کے الفاظ میں انسان اپنے خارجی وجود کو صرف ریاست ہی کی بدولت اپنے فکر کی داخلی دنیا کی بلند سطح پر پہنچا سکا ہے۔یہ حقیقی آزادی جو معاشرے میں پائی جاتی ہے اور اُسی کی تخلیق ہے فعال ہے اور نشوونما حاصل کر رہی ہے۔یہ سب سے پہلے قانون کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔اُس کے بعد اُس داخلی اخلاق کی حکمرانی میں جو فرد معاشرے سے حاصل کرتا ہے اور آخر میں اُن تمام عمرانی اداروں کے مجموعی نظام اوراثرات میں نظر آتی ہے جو شخصیت کی نشوونما میں اہم حصہ لیتے ہیں۔اس طرح ریاست ایک شخص کے لیے اُس آزادی کا حصول ممکن بنا دیتی ہے جو بصورت دیگر اُس کے لیے ناقابل حصول ہوتی۔ ہیگل کے الفاظ میں "ریاست اور صرف ریاست ہی آزادی کی مکمل ترین مظہر ہوتی ہے" یا بالفاظ دیگر آزادی کو مکمل ترین صورت بخشی ہے۔ریاست کی خاصیت صرف اس حقیقت کی بنا پر ہے کہ وہ بذات خود ایک حقیقی شخصیت اور حقیقی اردادے کی مالک ہوتی ہے۔اور چونکہ یہ اپنے اُن تمام شہریوں کے ارادوں کی نمائندگی کرتی ہے جو معاشرہ میں مجتمع رہنے کا عہد وبیان کرتے ہیں اس لیے یہ ایک ایسے وجود کو معرض وجود میں لائے کا سبب بن جاتی ہے جس کا ارادہ انفرادی ارادوں سے بلند اوراس کی شخصیت انفرادی شخصیتوں سے بالا اور برتر ہوتی ہے۔"[۱۹]

سیاسی تحریکیں معاشرے میں سیاسی بیداری پیدا کرتی ہیں۔قومی اتحاد اور وطن سے محبت کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ریاست سے شخصیت کا تعلق ہی ایسا ہے۔ریاست کبھی غیر نمائندہ حالت میں عمل نہیں کرتی ہے۔ریاست اپنے تمام معاشرے کے لیے عمرانی اخلاق کی حامل اور اس کی نمائندہ ثابت ہوتی ہے۔سیاسی نظام

ریاست میں اخلاقی روابط و تعلقات قائم کرتا ہے اور ہر شہری دوسرے شہری سے جڑا رہتا ہے۔ اخلاقی تعلقات قائم کرنے سے ریاست کبھی تباہ نہیں ہوتی۔ ریاست افراد کے لیے ہوتی ہے نہ کہ افراد ریاست کے لیے۔ آزادی صرف ایک فرد کے لیے معانی رکھتی ہے اور معاشرہ اور ریاست کی فلاح و بہبود اس وقت تک نہ کوئی معنی رکھتی ہے اور نہ قیمت جب تک وہ ان افراد بہبود اور بھلائی کی مد نظر نہ رکھے جن پر ریاست مشتمل ہوتی ہے۔

ز۔ اقتصادی ذرائع:

اقتصادی خود مختاری آسان نہیں ہے۔ اقتصادی خود مختاری کا مطلب معاشرے میں اقتصادی ذرائع کا وافر مقدار میں ہونا جس کی وجہ سے ملک و عوام اقتصادی طور پر اپنے پیروں پر کھڑے ہوں۔ جب کوئی ایک قوم اقتصادی اعتبار سے مضبوط ہوتی ہے وہ کسی دوسرے قوم کی محتاج نہیں ہوتی۔ مگر اس سے ہر گز یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ ایک قوم دوسرے قوم سے یا ایک ملک دوسرے ممالک سے لین دین ہی چھوڑ دے۔ اقتصادی طور پر مضبوط ہونے کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے تجارت کو بڑھاتے۔ بنیادی ضروریات کی اشیا کا خریدنا اور بیچنا اقتصادی معاملات کے ذریعے سے پوری دُنیا میں اپنا منفرد مقام بنانا ہے۔ ملک کے تمام کارخانے جب کام میں لائیں جائیں گے تو ملک کے محنت کش ملک کی خاطر کام کریں گے۔ محنت کش صرف مزدور نہیں ہوتا بلکہ جو معاشرے کے اندر معاشرے کے لیے مفید کام کرتا ہے۔ وہ اصل میں محنت کش کہلاتا ہے اور اسی جذبات سے اقتصادی ذرائع بنتے ہیں۔ کوئی شخص اپنے ذمہ کا کام جب باخوبی سرانجام دے گا تو معاشرہ اقتصادی لحاظ سے خود مختاری حاصل کرے گا۔ پیسہ زندگی میں روزمرہ کی کوششوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ صنعتی عروج ہی کسی معاشرتی ترقی کی علامت ہوتا ہے۔ ای ایم جوڈ کا کہنا ہے:

> ”بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ کی خوشحالی قدرتی ذرائع کی وجہ سے ہے۔ امریکہ کی ترقی خلا میں ہوئی ہے۔ وہ ترقی کی حقیقی وجوہات یعنی اقتصادی اور سیاسی نظاموں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جن کی وجہ سے امریکہ اس قدر ترقی یافتہ ہوا۔ اقتصادی خوشحالی کے حصول کے لیے آمرانہ طریقوں کو مؤثر سمجھنے والے اصحاب بھی اس امر کا احساس کرتے ہیں کہ وہ امریکہ کے سیاسی اور اقتصادی ترقی کی حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔“[۲۰]

معاشرتی علوم کی اہم شاخ اقتصادیات ہے اور یہ تہذیب کا بنیادی جزو ہے مادی وسائل و پیداوار کی ضرورت معاشرے کی ریڑھ کی ہڈی کی صورت رکھتا ہے۔ماہرِ اقتصادیات انسانی رویے کا مطالعہ کرتے ہیں کیونکہ انسانی ضروریات روز بہ روز طلب و رسد کا مطالبہ کرتی ہیں۔ معاشرے کی جب بات ہوتی ہے تو معاشی نظام کا مضبوط ہونا اہمیت کا حامل ہے۔ کسی بھی قوم کی کوئی بھی تہذیب ہو وہ تہذیب معاشی نظام کے ارد گرد گھومتی ہے تہذیبیں اس اقتصادی یا معاشی نظام کو قوموں کی ضروریات کے مطابق مختلف امور کا جائزہ لیتی ہیں۔ تہذیبیں اپنے مقاصد، معاشی ارتقا کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں۔ اقتصادی نظام کو کامیاب بنانے کے لیے ہر تہذیب کی قوم میں ہر فرد کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اس پر ایک منصوبہ بندی کے ذریعے اس کی اہمیت کو اجاگر کرے۔ تہذیب کا لفظ قانونی طور پر استعمال میں لانے کے لیے یورپی استعمار نے کچھ علاقوں کو اپنے قبضے میں لیا اور اسے تہذیب کا ایک اہم جزو بنایا۔ موجودہ دورانسان کی پیدائش کے وقت ساتھ ساتھ اس کی خواہشات بھی بڑھتی جاتی ہیں جب تک انسان میں دم ہے اس کی ضروریات خواہشات کی نوعیت بہت زیادہ ہے اور اپنے اندر تنوع رکھتی ہیں۔ اس کے برعکس دیکھا جائے تو قدیم دور میں انسانی ضروریات بہت سادہ اور آسان طلب سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن تہذیب کے حوالے سے دیکھا جائے تو ضروریات ،خواہشات میں تیزی اور تنوع پایا گیا ہے۔ قدیم دور ہو یا جدید دور انسانی ضرورتوں میں بنیادی چیزوں کو کوئی بھی تہذیب نظر انداز نہیں کرسکتی یا اس کے بغیر تہذیب وضع نہیں ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر انسان کی بنیادی ضروریات میں غذا، جسم ڈھاپنے کے لیے کپڑوں کا بندوبست اور رہن سہن کے لیے گھر وغیرہ کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔اس طرح تعلیم ، آرام وآسائش، تفریح ومسرت کا سامان اور کچھ مزید ضروری اشیا کے لیے انسان جدوجہد کرتا ہے اور اپنی حاجات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔کسان ،مزدور، کلرک، تاجر،ڈاکٹر،انجینئر،وکیل،ڈرائیور وغیرہ ہر شخص اپنے کاموں میں مصروف رہ کر آمدنی حاصل کرتا ہے۔ حبیب حق نے اس حوالے سے اپنے فکر وفن کا اظہارِ خیال کچھ اس طرح سے کیا ہے۔

> ”یورپ کے جنوب مغربی کونے میں ملک یونان واقع ہے، جہاں شمال سے آنا مشکل ضرور ہے لیکن واپس جانا تقریباً ناممکن ہے۔ یہاں کی سرزمین پہاڑوں اور وادیوں سے مل کر بنی ہے۔ سمندر ان کا اٹوٹ حصہ ہے۔ قدیم یونانی قبیلے شمال سے آئے، اور اس خطے پر قابض ہو گئے ۔یونان تضاد کا ملک ضرور ہے ، لیکن انتہا پسند کا شکار نہیں۔ جاڑوں میں خوب دھوپ نکلی ہے، گو گرمیوں میں خاصی تمازت ہوتی ہے۔ لیکن آب وہوا کبھی مرطوب نہیں ہوا

کرتی۔ علاقے ایک دوسروں سے پہاڑوں کی وجہ سے کٹے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کا رشتہ سمندروں کے ذریعہ قائم ہے۔ ندیاں گرمیوں میں خشک ہو جاتی ہیں، سردیوں میں ان میں طغیانی آ جاتی ہے۔ ملک کی آبادی کبھی زیادہ نہ ہو سکی۔ مویشیوں کی بڑی تعداد کبھی پنپ نہ سکی۔ یہاں زیتوں کے تیل کا خوب چلن رہاہے جو کہ پکانے کے کام بھی آتا ہے۔ پھل اور مخصوص سبزیاں مخصوص علاقوں میں اگائی جاسکتی ہیں۔ گوشت کا استعمال کم رہا ہے۔ مچھلیاں مرغوب رہی ہیں۔ شراب خوب کشید کی جاتی رہی ہے۔ پھولوں کی بہتات کی بناپر شہد کی خاصی پیداوار رہی ہے۔ بکریاں دودھ اور پنیر مہیا کرتی ہیں۔ اس سرزمین نے یہاں کے باسیوں کو مضبوط، حرکت پسند پُرجوش اور سمجھ دار بنایاہے۔"[۲۱]

جس ملک میں سیاسی اور انتظامی امور بہتر طور پر نہ ہوں وہاں اقتصادی، معاشی اعتبار سے حالات ٹھیک نہیں ہوتے۔ ہنگامے اور فسادات جہاں ہوں گے وہاں اقتصادی حالات توقعات کے عین مطابق نہیں ہوں گے۔ افلاس، بیماری، بنیادی امراض کا خاتمہ حکومت کا فرض ہوتا ہے اس سے ملکی اقتصادی معاشی نظام بھی بہتر ہوتا ہے۔ اقتصادی حالت کا کمزور ہونادراصل عوام کو مشتعل کرنے راستہ ہے۔ اقتصادی پروگرام بنانے والے اس کردار کا بخوبی احساس رکھتے ہیں جو زراعت ملک کی معیشت میں ایک منظم کردار ادا کرسکتی ہے۔ اصل میں ایسے ملک میں زراعت کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

اقتصادی بحران کے دنوں میں جب زیادہ تر فیکٹریاں اپنی کل پیداواری صلاحیت کا صرف پچاس فیصد پیداوار دے رہی ہوتی ہیں۔ زراعت پر مبنی صنعتیں پوری صلاحیت کے مطابق کام کرتی ہیں اور اپنی برآمدات کے ذریعے ملک کو وہ غیر ملکی زرمبادلہ فراہم کرتی ہیں اور یہ عمل کسی بھی ملک کی معیشت کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔

صنعتی انقلاب کی بات کریں تو انگلینڈ صنعتی انقلاب کا مرکز تھا۔ اس اقدام میں جن کا ہاتھ رہاہے اُن میں شامل جیمس ہارگریوز، رچرڈ آرک رائٹ اور سیموئیل کراپیٹن کی پارچہ کی مشینری کی ایجادات ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تھامس نیوکم، رچرڈ وائٹ اور جارج سٹیفن سن کے بھاپ کے ایجنوں کی ایجاد نے صنعت کی ترقی میں اہم کردار ادا کیاہے۔ انگلینڈ نے کوئلہ، کپڑا اور لوہا بنانے میں اہم مقام حاصل کیا۔ صنعتی حوالے سے معاشی تنظیم کس طرح سے کام کرتی رہی اس سلسلے میں ول ڈیورانٹ لکھتے ہیں:

”تجارت نے غیر متمدن دنیا کو درہم برہم کر کے رکھ دیا کیونکہ اس کے شروع ہونے سے دولت اور منافع کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے ملکیت کا تصور نہیں تھالہذا حکومت بھی نہیں تھی۔ معاشی ارتقاکے ابتدائی مراحل میں ملکیت زیادہ تر ذاتی استعمال کی اشیاتک محدود تھی۔ایسی اشیاء(جن میں بیوی بھی شامل ہے) کے ساتھ ملکیت کا ایسا تصور وابستہ تھا کہ انہیں اس کے مالک کے ساتھ ہی دفن کر دیا جاتا تھا۔ اس کا اطلاق ایسی چیزوں پر بہت کم ہوتا تھاجو ذاتی استعمال میں نہیں تھیں۔ان کے معاملے میں ملکیت کا تصور مسلسل تعلیم کا متقاضی تھا۔ غیر متمدن لوگوں میں تقریباہر طرف زمین کمیونٹی کی ملکیت ہوتی تھی۔ شمالی امریکی انڈینز، پیرو کے باشندے، انڈیا(بنگلہ دیش کے چٹاگانگ) پہاڑی قبیلے اہل بورینااور جنوبی سمندری جزیروں کے باسی مشترکہ طور پر زمین کی ملکیت رکھتے، اسے کاشت کرتے اور اس کی فصل میں مل کر شریک ہوتے تھے۔اوماہا انڈینز کہتے تھے زمین پانی اور ہوا کی طرح ہے جو فروخت نہیں کی جاسکتی۔ سفید فاموں کی آمد سے قبل سمووامیں زمین بیچنے کا تصور ناپید تھا۔پروفیسر ریورز نے میلینیا اور پولی نیا میں زمین کی اشتراکیت دیکھی اور اندرونی لیبیریامیں یہ آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔“[۲۲]

ایک طرف سرمایہ داری کا دور ہے اور دوسری طرف کمیونزم اور سوشلزم کی یلغار جاری ہے۔ تیسری جانب دنیا میں مختلف ممالک ترقی پذیر اور کچھ پسماندہ ممالک سامنے آرہے ہیں۔اقتصادی ذرائع کی اگر ملک میں مضبوط نہیں ہو گی تو وہ ملک کبھی بھی دنیا میں اپنا مقام حاصل نہیں کر سکتا یعنی دنیا میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔اقتصادی طور پر مضبوطی معاشرے خوشحالی کی ضمانت ہے۔اگر کسی بھی ملک کا اقتصادی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہے گاتو پسماندگی اُس ملک کا مقدر بن جاتا ہے۔

قدیم دور میں جب لوگوں کی زندگی میں معاشی مسائل پیدا ہوئے تووہاں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو معاشی اعتبار سے مضبوط اور کامیاب تھے۔ غیر تہذیب یافتہ یعنی غیر مہذب لوگوں میں یہ بات بہت عام دیکھی گئی وہ دوسروں کی مدد کیا کرتے تھے جن لوگوں کے پاس کھانے پینے کی اشیا ختم ہو جاتی اُن لوگوں کو معاشی اعتبار سے خوشحال لوگ اپنے ساتھ شریک کر دیا کرتے تھے۔مسافروں کے لیے رہن سہن کا انتظام کر لیتے تھے۔جو لوگ خوراک کی کمی کا شکار ہو جاتے تو ہمسائے اُن کے کھانے کا بندوبست کر لیتے تھے۔قدیم دور میں اچھے لوگوں کی ایک

ادا بہت خوب تھی کہ کوئی بھی جب کسی راستے یا جنگل میں ہوتا تو کچھ کھانے سے پہلے لوگوں کو آواز دیتا اور انھیں اپنے ساتھ کھانے میں شامل کر لیتا تھا۔ اس غیر مہذب معاشرے کے حوالے سے ول ڈیورانٹ لکھتے ہیں:

"جب ٹرنر نے سموا کے ایک باشندے کو لندن کے غریبوں کے متعلق بتایا تو اس غیر متمدن نے حیرانی سے پوچھا یہ کیسے ہو سکتا ہے غذا نہیں؟ دوست نہیں؟ رہنے کو گھر نہیں؟ وہ کیسے بڑا ہوا؟ اُس کے دوستوں کے گھر نہیں؟ کسی بھوکے ہندوستانی کو کہنے کی دیر تھی، کھانا خواہ کتنا ہی کم ہو اسے ضرورت پڑتی تو مل جاتا۔ کسی کو غذا کی کمی نہیں پڑ سکتی اگر شہر میں کسی بھی جگہ غلہ موجود ہے۔"[۲۳]

کھانے کی اشیا کے ساتھ ساتھ ضروریات کی دوسری چیزوں کو بھی لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس معاشرے کے لوگ برابر ہو جاتے تھے۔ سفید فام اور سیاہ فام ایک دوسرے کا خیال کرتے تھے۔ یہ مثال قابلِ ستائش رہی ہے۔ لوگوں میں آپس کی محبت اور شرافت بے مثال تھی ایسا تہذیب یافتہ لوگوں کو نہیں دیکھا گیا مگر غیر متمدن لوگوں نے منظم طریقے سے سب کو حیران رکھا۔

"زراعت، غلامی، محنت کی تقسیم اور موروثی انسانی تفاوت کے سبب فطری معاشرے کی تقابلی برابر بتدریج عدم مساوات اور طبقاتی تقسیم میں بدل گئی۔ غیر متمدن گروہ میں ہم اصولی طور پر غلام اور آزاد میں کوئی تفریق نہیں پاتے۔ نہ ہی غلامی، ذات پات، سردار اور رعایا میں کوئی امتیاز موجود ہے۔ رفتہ رفتہ اوزاروں اور تجارت کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی نے غیر ہنر منداور طاقتوروں کا غلام بنادیا۔ ہر نئی ایجاد طاقتوروں کے ہاتھ میں نیا ہتھیار تھی۔ جس نے کمزوروں پر غلبہ پانے اور ان کے مزید استعمال میں طاقتوروں کی مدد کی۔ وراثت نے جائیداد میں اضافے کا اعلیٰ موقع پیدا کیا اور ایک عہد کے متجانس معاشرے کو طبقات اور ذات پات میں تقسیم کر دیا۔ امیر اور غریب بُری طرح امارت اور غربت کے متعلق باشعور ہوتے گئے۔ طبقاتی جنگ ساری تاریخ کے درمیان ایک سرخ لکیر بنتی گئی اور ریاست، طبقات کو منضبط کرنے، جائیداد کو تحفظ فراہم کرنے، جنگ کرنے اور امن قائم کرنے کے لئے ناگزیر آلہ کار کے طور پر سامنے آئی۔"[۲۴]

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی ہاتھوں کا صنعتی ترقی میں بہت عمل دخل ہے مگر بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ انسانی ہاتھوں سے نکل کر یہ کام مشینوں نے لے لیا۔ مختلف چھوٹے چھوٹے کارخانے اب بڑے کارخانوں میں تبدیل ہوگئے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ کا فاصلہ طے کرنے کے لیے ریلوں کا جال بچھانا اچھا اقدام ہے۔ سڑکیں بنانا کشتیوں کے بجائے جہازوں کا استعمال کرنا۔ انگلینڈ کے صنعتی ترقی کے حوالے سے پہلے صنعتی مرکز کی حیثیت حاصل کی ہے۔ کوئلے کی طرح لوہے، کپاس کی پیداوار بھی انگلینڈ سے یورپ کے دوسرے ممالک میں پھیلتی گئی۔ انگلینڈ کے بعد فرانس نے بہت سی اہم صنعتی حوالے سے ترقی کی۔ اس طرح جرمنی نے بھی بہت سی چیزوں کو ایجاد کیا جس سے صنعتی مسائل میں کمی ہوئی۔ لیکن جنگی حالات اور جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے جرمنی اور فرانس اقتصادی طور پر مفلوج ہو گیا۔

صنعتی انقلاب سے بہت سے ممالک کو فائدہ ہوا لیکن اس انقلاب کی وجہ سے امیر سرمایہ دارنہ طبقے کی بھی جنم دیا۔ اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے سرمایہ دار کے خلاف آواز بلند ہوئی پیشتر جگہوں پر شدید خانہ جنگ شروع ہوئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے محنت کش عوام کاشت کاروں کی بڑی تعداد جو کہ اپنا کاروبار کرتے تھے خود مختار پیداوار کرنے صلاحیت رکھتے تھے۔ اپنی زمینوں کی کاشت چھوڑ کر دوسرے کارخانوں میں ملازمت اختیار کرنے لگے۔ اُن کی زمینوں پر سرمایہ داروں نے قبضے کیے۔ کاشت کار مزدوری کرنے پر مجبور ہو کر رہ گیا۔ دستکاروں کی کثیر تعداد اپنی چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں ختم کر کے بڑے بڑے صنعتی کارخانوں میں ملازمت کرنے لگے۔

دُنیا میں جتنے بھی انقلابات ماضی میں رونما ہوئے ہیں وہ تمام تر سیاسی نظام پر تھے۔ سرمایہ دارنہ طبقے، معاشی حوالے سے مضبوط طبقے نے چھوٹے طبقے معصوم لوگوں کو غلام بنانے کی بہت کوشش کی۔ اُن لوگوں نے خود غرضی اور عیاری کے بل بوتے غربا کا استحصال کیا۔ جب چھوٹے طبقے کے لوگوں کو موقع ملا تو انہوں نے سرمایہ دار لوگوں سے اپنا حق چھیننے کے لیے انقلابی صورت میں آگے بڑھے اور کامیابی حاصل کی۔ اب دورِ حاضر کی تصویر قدیم دور سے مختلف ہے۔ آج کل آسانی سے زندگی گزارنے کے لیے کوشش کی جاتی ہے۔ داخلی اور خارجی جنگی حالات سے نبٹنے کے لیے اقدامات کی جاتے ہیں تاکہ اس دُنیا میں اپنے ملک کو بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن سرمایہ دار طبقہ آج بھی اپنی دولت کو بچانے کے لیے دُنیا میں نت نئے نظام متعارف کروا رہا ہے جس سے تہذیب و تمدن کی ایک ایسی فضا جنم لے رہی ہے جس میں عجلت اور خود غرضی ہی "مہذب" ہونے کی اعلیٰ علامت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سبطِ حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، مکتبہ دانیال کراچی ۲۰۱۷ء ص ۱۷

۲۔ عابد حسین، سید، قومی تہذیب کا مسئلہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۱۹۹۸ء ص ۱۵

۳۔ ایضاً، ص ۱۷

۴۔ نگار سجاد ظہیر، ڈاکٹر، مطالعۂ تہذیب، قرطاس گلستان جوہر بلاک 15 کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۷

۵۔ عابد حسین، سید، قومی تہذیب کا مسئلہ، ص ۱۳۔ ۱۴

۶۔ شبلی صاحب، مولانا، مترجم، تاریخِ تہذیب و تمدن، بک ٹائم کراچی، ۲۰۱۳ء ص ۱۴

۷۔ قاسم محمود مرحوم، سید، مترجم، نقوشِ ثقافت، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۲۱-۲۲

۸۔ محمد طاہر القادری، ڈاکٹر، سیرۃ الرسول ﷺ کی تہذیبی و ثقافتی اہمیت، منہاج القرآن پرنٹرز لاہور، ۲۰۰۷ء ص ۲۷

۹۔ ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقا، (مترجم) تنویر جہاں، فکشن ہاوس 18- مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۹۴۔ ۹۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۹۸

۱۱۔ ظ انصاری، کمیونسٹ اور مذہب، مکتبہ شاہراہ دہلی، ۱۹۸۵ء ص ۱۱

۱۲۔ حسن دین احمد، ہندوستان کا معاشرتی نظام، ادارہ معاشیات فاطمہ منزل حمایت نگر دکن حیدر آباد، س۔ن، ص ۶۲

۱۳۔ جمیل جالبی، پاکستان معاشرہ اور ادب (ادب کا سماجی پہلو) مرتبین، سید حسین جعفری، سلیم احمد، پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی، ۱۹۸۷ء ص ۱۸

۱۴۔ ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقا، (مترجم) تنویر جہاں، ص ۸۵۔ ۸۶

۱۵۔ ایضاً، ص ۸۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۷۔ ریحان عزیز، معاشرہ اور سرمایہ داری www.rejectingfreedomandprogress.com ، ۴ فروری ۲۰۱۹ء، 09:29am

۱۸۔ ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقا، (مترجم) تنویر جہاں، ص۳۶

۱۹۔ سی۔ای۔ایم۔جوڈ، عبدالمحصی، مترجم، تعارف جدید سیاسی نظریہ، مجلسِ ترجمہ کارواں پریس ایبک روڈ انار کلی لاہور، س۔ن، ص۴۔۵

۲۰۔ ڈی۔جی۔کولاس، آر۔کے۔جی، مترجم، اقتصادی ترقی کی کنجی، حالی پبلیشنگ ہاوس دہلی، س۔ن، ص۸

۲۱۔ حبیب حق، یونانی تہذیب کی داستان، نگارشات پبلشرز، 24۔مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۱۵ء، ص۱۵

۲۲۔ ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقا، (مترجم) تنویر جہاں، ص۲۸

۲۳۔ ایضاً، ص۲۹

۲۴۔ ایضاً، ص۳۳

باب دوم:

ناول "زینو" میں تہذیبی عناصر

الف۔ناول کا مرکزی دائرہ

وحید احمد کا ناول یونانی فلسفی زینو کے فلسفے کا احاطہ کرتا ہے۔زینو کے فلسفے کے حوالے سے علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:

پارمی نائدیس اور زینو کی اولیات درج ذیل ہیں:

(۱) وہ مابعد الطبیعیات اور جدلیات کے بانی ہیں۔انسانی فطرت کے دوپہلو ہیں۔ ایک اُسے تصوف کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا سائنس کی طرف۔ ان کے اتحاد یاکشمکش سے فکر وتدبر کو بروئے کار لاکر کائنات کو ایک کُل کی صورت میں تصور کیا گیاہے اور اسے 'حقیقت مطلق' کہا گیاہے۔مابعد الطبیعیات اسی حقیقت مطلق کی جستجو کا نام ہے۔

(۲) انہوں نے حس اور عقل۔ غیر مرئی حقیقی اور مرئی غیر حقیقی۔ ظاہر اور باطن میں تفریق کرکے مثالیت پسندی کا اصل اصول قائم کیا۔

(۳) پارمی نائدیس منطق یا جدلیات کو مابعد الطبیعیات کی کلید سمجھتا تھا۔بعد کے مثالیت پسندوں اور عقلیت پرستوں نے یہی روش اختیار کی۔

(۴) ارسطو نے زینو کی جدلیات ہی کو نئے سرے سے مرتب کرکے منطقِ قیاسی کی بنیاد رکھی تھی۔

(۵) الیاطیوں کا 'ایک' کا تصور افلاطون کے 'خیر مطلق' رواقیئن کی 'عقل آفاقی' اور نواشراقیوں کے 'احد' کی صورت میں نمودار ہوتا رہا۔

(۶) تمام اشیاء کے اصلاً ایک ہونے کا انکشاف کرکے پارمی نائدیس نے مذہب وتصوف کو وحدت وجود اور فلسفے کو احدیت کے تصورات دیے۔یہ نظریہ اُسی سے یادگار ہے کہ کائنات ایک 'کُل' ہے اور کثرت نگاہ کا فریب ہے۔

(۷) زمان غیر حقیقی ہے۔ تغیر و حرکت کے انکار سے زمان حقیقی نہیں رہ سکتا۔ اگر کائنات ایک 'کُل' ہے اور ہر کہیں حقیقت واحد ہی کا جلوہ ہے تو ماضی، حال اور مستقبل کی تفریق فریب نظر ہوئی۔ یہ تصور بعد میں سپنوزا، ہیگل اور وجودیوں نے زیادہ شرح وبسط سے پیش کیا تھا۔[1]

زینو، ایک جدید طرز عمل کا ناول ہے۔ یونان کا مشہور فلسفی زینو جو وقت کے ہمراہ سفر کرتا ہے اور ایک سونے سے بھری کشتی کے ساتھ زینو سکندر الیگزینڈر، دارا اول سے ملتا ہے۔ اور ٹیکسلا میں کوتلیہ اچاریہ چانکیہ سے بھی ملتا ہے اور یہ سفر صدیوں پر محیط ہے۔ پھر زینو برف کے نیچے دب جاتا ہے اور کئی ہزار سال کے بعد وہ دوبارہ جدید دور میں جی اٹھتا ہے۔ یہاں میجک رئیلزم کی تکنیک سے وحید احمد نے ناول کو ایک نیا رنگ دیا ہے۔ زینو کے ہاں مسائل کا حل ہوتا ہے۔ وہ ضرورت کے مطابق ہر دور کے در پہ دستک دیتا ہے۔ وہ سرمایہ دار نظام سے لے کر کمیونزم کی خوبیاں اور برائیوں کو بڑی مہارت کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔

زینو صدیوں کا سفر طے کرتے ہوئے آج کے دور میں پہنچا ہے۔ زینو نے دیکھا کہ انسان اسی طرح لالچ کے جال میں جکڑا ہوا ہے۔۔ دولت، لالچ سب کچھ خرید لینے اور ساری دنیا پہ حکومت کی آرزو کی "تہذیب" کی ابتدا دارا اور سکندر سے ہوئی اور مختلف ادوار میں اپنے اندر مختلف عناصر کرتے ہوئے آج کے دور تک پہنچی اور آج کی سپر طاقت تک منتقل ہو گئی ہے۔ وحید احمد ہر بڑے لکھاری کی طرح صدیوں کا سفر طے کرتا ہے جو اس مسئلے کا حل بھی ہے۔ وہ بیماری کی نشاندہی کرنے کا نہیں سوچتا لیکن اس کا علاج کرتا ہے اور وہ علاج کیا ہو گا کیسے ہو گا؟ کہ انسان کو دوبارہ بنانا ہے اور ایسا انسان جو اپنے مستقبل کو ایک نئے زاویے سے سوچے۔ کیونکہ انسان کے دماغ میں ایک ایسا حصہ ہوتا ہے جو مستقبل کو سوچتا ہے اور وہ حصہ بہت توانا ہوتا ہے۔ اور وہ حصہ انسانی کی تمام ذہنی صلاحتوں پر حکومت کرنے کی قوت رکھتا ہے اور یہ زینو کی برسوں کی محنت اور تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اور یہ ناتمام آرزو ایک فرار کی صورت میں ہے۔ اس فرار کو جادوئی حقیقت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر نئی بڑی ایجاد، دریافت اور تحقیق کئی صدیوں کی بے آرامی، بدحالی کا حاصل تو نہیں ہے۔ جس طرح پریوں اور جنوں کی کہانیوں میں جادوئی منظر اور اڑن کھٹولا جیسے مناظر ہوتے تھے۔ جس میں دیس دیس کی خبریں مل جایا کرتی تھیں۔ اور وہ سب جادوئی عمل؛ جادوئی منظر آج کے جدید دور میں حقیقت کی صورت میں موجود ہے۔ یعنی ایک بہتر انسان کی تخلیق ہو سکتی ہے۔

ب۔ یونانی فلسفے کا پس منظر:

فلسفے کی تاریخ میں جس تہذیب و تمدن اور علاقے کے فلاسفہ کا سب سے زیادہ ذکر آتا ہے وہ خطۂ یونان ہے۔ جس میں نہ صرف فلسفے نے بطور علم پرورش پائی بلکہ فلسفے کے بنیادی مباحث کو یونان کے فلاسفہ نے پوری تفصیل کے ساتھ واضح کیا۔ ابتدائی طور پر یونانی فلسفے میں دو طرح کے رجحانات ملتے ہیں جس میں سے ایک مادیت پسندی اور دوسرا مثالیت پسندی ہے۔ مادیت پسندی کے حوالے سے علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:

ماقبل سقراط فلاسفۂ مادیت نے جو اصول مرتب کیے تھے وہ بعد کے مادیت پسندوں نے اپنائے اور اُن کی مزید تشریح کی۔ یہ اصول درج ذیل ہیں:

(۱) مادہ وہ ہے جو مکان میں پھیلا ہوا ہے۔

(۲) مادہ ازلی اور غیر فانی ہے۔

(۳) مادے میں حرکت کی صلاحیت موجود ہے۔

(۴) تمام حرکت مقررہ قوانین کے تحت ہو رہی ہے۔

(۵) شعور اور ذہن بھی دوسری اشیاء کی طرح ایٹموں سے مرکب ہیں۔

(۶) فطرت (نیچر) میں کوئی واردات بغیر سبب کے نہیں ہوتی۔

(۷) عالم میں کوئی ذہن یا شعور کارفرما نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس پر کوئی یزدانی قوت متصرف نہیں ہے۔

(۸) عالم میں کوئی مقصد و غایت نہیں ہے۔[۲]

مثالیت پسندی کیا ہے اور یونانی فلسفے میں اس کی کیا اہمیت تھی۔ اس حوالے سے جلالپوری لکھتے ہیں:

"مادیت پسندوں کے خیال میں مادہ حقیقی ہے اور ذہن اس کی نمود ہے۔ اس کے برعکس مثالیت پسندوں کا دعویٰ ہے کہ ذہن حقیقی ہے اور مادہ اس کا عکس ہے۔ تاریخِ فلسفہ میں یہ نزاع قدیم زمانے سے یادگار ہے۔ اس بات کا شروع ہی سے ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ تاریخی لحاظ سے مادیت کا تعلق ہمیشہ سائنس سے رہا ہے اور مثالیت ہمیشہ مذہب سے وابستہ رہی ہے۔ مائلٹس کے باشندوں طالیس۔ اناکسی مینڈر اور اناکسی مینس کا نقطۂ نظر تحقیقی اور علمی تھا کیوں کہ انہوں نے مروجہ مذاہب کے صنمیاتی خرافات سے قطع نظر کر کے مظاہر کائنات کی براہ راست توجیہ و تشریح کرنے کی جسارت کی تھی۔ مثالیت پسندی میں عارفی مت۔ دیونیسیس کی پوجا۔ الیسینی اسرار وغیرہ کے باطنیہ عناصر شامل ہو گئے۔

افلاطون کو مثالیت پسندی کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس کے نظریات میں عقلیت اور عرفان، منطق اور باطینت مخروج صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ مورخین فلسفہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ افلاطون نے فیثا غورس۔ پارمی نائدیس۔ ہیر یقلیتس اور سقراط کے افکار میں مطابقت پیدا کر کے اپنا نظام فلسفہ مرتب کیا تھا۔"[۳]

اس کے علاوہ اور بہت سے رجحانات تھے جو درجہ بہ درجہ ترقی کرتے ہوئے جدید فلسفے کے مباحث میں ہم آمیخت ہو گئے۔

ج۔ زینو کے فلسفے کی روایت:

زینو یونان کا فلاسفر تھا اور جزیرہ سائپرس میں سٹیم کا رہنے والا تھا۔ جو ایک یونانی شہر تھا۔ زینو رواقی جماعت کا سربراہ تھا۔ زینو اخلاقیات میں صرف اصول کی بات کرتا ہے۔ زندگی کے حوالے سے تفصیلی قواعد کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ وہ خود علم و حکمت کو اخلاقی عمل کے لیے بہت ضروری سمجھتا ہے۔ اس نے اخلاقیات، طبیعیات اور منطق میں فلسفہ کی تقسیم کو افلاطونیوں سے لیا ہے۔ منطق لفظ زینو نے سب سے پہلے استعمال کیا تھا۔ زینو نے ادراک کے حوالے سے کہا کہ یہ یادداشت سے پیدا ہوتی ہے اور اسے تجربہ سے بھی حاصل کیا جاتا ہے اور اس نتیجے سے ہم کلی تصورات پر پہنچتے ہیں جو علمی اعتبار سے پیشتر انسانوں کے عقائد کو متعین کیا جاتا ہے۔ زینو کے مطابق انسان سے گہرا ربط ضروری ہے۔ انسان اپنی عقلیت کی وجہ سے اپنے آپ کو ایک عالم گیر کُل کا جز سمجھتا ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ کُل کے لیے کام کرے۔ اسے علم ہے کہ تمام عقلی ہستیوں سے اس کا فطری ناتا ہے۔ وہ تمام انسانی مخلوق کے حقوق و فرائض میں مساوات کا قائل ہے۔ اس کے علاوہ زینو کہتا ہے کہ تمام انسان ایک ہی قانون پر انحصار کرتے ہیں اور ایک ملک کے شہری کہلاتے ہیں۔ ہر انسان، انسان ہونے کے تحت حسنِ سلوک کا حق دار ہوتا ہے۔ چھوٹے طبقے کے لوگ اور غلام بھی اپنے حقوق کی خاطر جی رہے ہیں اس لیے اُن کی عزت بھی کرنا لازم ہے۔ زینو نے دشمنوں کے حوالے سے کہا کہ وہ بھی حق دار ہیں کہ ہم اُن سے رحم کا مظاہر کریں اور ہم اُن کی طرف سے رحم کے منتظر اور آس کے متلاشی ہو سکتے ہیں۔ اور وہ اپنے پراداکسز کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ ایتھنز میں زینو لوگوں کو فلسفے کے حوالے سے درس دیتا تھا۔ زینو خدا کا منکر ہونے کے ساتھ ساتھ حرکت (Motion) کا بھی انکاری تھا۔ اس کے نزدیک حرکت کا کوئی امکان ہی نہیں کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ ایک فاصلے سے دوسرے فاصلے تک کا سفر طے کرنے کے لیے پہلے ان دونوں فاصلوں کا درمیانی یعنی نصف فاصلہ یا

حصہ طے کرنا لازمی ہے۔ اور ان دونوں فاصلوں کا نصف فاصلہ طے کرنے کے لیے ہم اُس کا بھی نصف فاصلہ یا حصہ پہلے طے کریں گے یعنی فاصلوں کی تقسیم در تقسیم کے عمل سے یہ سلسلہ تو کبھی بھی ختم نہیں ہوتا ہے۔ زینو نے کہا کہ جب تیر کو ہوا میں چھوڑا جاتا ہے تو تیر ہوا میں ساکن رہتا ہے۔ زینو کے منطقی دلائل کو بہت سے فلاسفہ نے رد بھی کیا ہے۔ تیر کی ساکن حالت کے حوالے سے اس کی منطق درست نہیں ہے۔

د۔ ناول "زینو" میں تہذیبی عناصر:

ڈاکٹر وحید احمد کا ناول زینو اپنے موضوع کے لحاظ سے جدید ناول ہے۔ اس ناول میں مختلف اسالیب کے ذریعے سے قدیم و جدید انسانی موضوعات کو مختلف جہات سے برتا گیا ہے۔ اس ناول میں جو بات سب سے زیادہ بہتر انداز میں ابھر کر سامنے آتی ہے وہ تہذیبی عناصر کے مختلف اظہاریے ہیں۔ مختلف تہذیبی عناصر کے ذریعے سے اس ناول کو ادبی و فنی لحاظ سے ثروت مند بنایا گیا ہے۔

i۔ سماجی اقدار:

کسی بھی تہذیب کو سمجھنے کے لیے سماجی اقدار کی تفہیم بہت بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ معاشرہ تہذیب کے ساتھ باہمی تعلق ہمیشہ استوار رکھتا ہے۔ معاشرے میں انسانی زندگی درحقیقت ایک جماعت کی حیثیت سے ہے۔ جس میں ہر انسان رہن سہن کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی خوشگوار بنانے کے لیے اپنی ترقی اور فلاح و بہود کا راستہ چنتا ہے اور دوسرے لوگوں سے تعلق قائم کرتا ہے۔ معاشرہ بنانے کے لیے معاشرتی اقدار بہت ضروری ہوتی ہیں۔ ہر فرد کا سماج کے ساتھ ایک ابلاغ کی صورت تعلق ہوتا ہے۔ معاشرے کے ڈھانچے کے لیے چند عوامل بہت ضروری ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے سب سے اول اور اہم مرحلہ زبان و ادب کا ہوتا ہے۔ زبان وادب کا معاشرے میں ایک اہم مقام ہے۔ معاشرے کی اول قدر اسی سے جانی جاتی ہے۔ دُنیا کے کسی کونے میں انسان چلا جائے مگر زبان وادب کے بغیر وہ نامکمل ہوتا ہے۔ معاشرتی اقدار کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ رسم و رواج، تہذیب و روایت، آدابِ زندگی، طرزِ فکر اور اخلاق و نظریات سے ہر فرد کا واسطہ پڑتا ہے۔ انسان جب کسی چیز کی تعمیر کرنے کے لیے قدم اٹھاتا ہے تو سب سے پہلے ایک مقصد اپنے سامنے رکھتا ہے اور اُس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اپنے ذہن میں منصوبہ بناتا ہے تاکہ اسی کے مطابق اسے مکمل کر سکے۔ سماج کے حوالے سے صالحہ زریں لکھتی ہیں:

"انسان اپنے فطری تقاضوں کے تحت اور گرد و پیش کے ماحول کے زیر اثر ایک مخصوص فضا اور ماحول میں پرورش پا کر اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں، تصور و تخیل کی نئی نئی دنیا بنا تا رہتا ہے۔ اور اس طرح سماج اور معاشرہ نیز تعمیر و تشکیل کے مختلف کارخانے قائم ہو کر کے سماج کی تعمیر کی مشینری بنتے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں فطرت بھی انسان کی مدد کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح اس کی تمام دلچسپیوں اور صلاحیتوں میں فنِ لطیف انسانی زندگی کا سب سے اچھا کارنامہ سمجھا گیا ہے۔ مصوری ہو یا رقص ہو یا ادب کے دوسرے معاملات۔۔ یہ سچ ہے کہ مصوری اور موسیقی بھی انسان کے نازک احساسات و جذبات کا حصہ ہیں لیکن ان میں سے کوئی شے ایسی نہیں ہے۔ جس کا تعلق سماج اور معاشرے سے نہ ہو۔"[۴]

معاشرے میں ہر فرد کی اپنی شخصیت ہوتی ہے اس کا ایک الگ مقام ہوتا ہے اسے آزادی سے جینے کا حق ہوتا ہے۔ رنگ و نسل کا فرق رکھنے سے سماج کبھی بھی نہیں بنتا بلکہ ٹوٹ کے بکھر جاتا ہے۔ چھوٹے طبقے کے لوگ بھی اپنا منشور رکھتے ہیں اور ان کا بھی اتنا ہی کسی سماج میں حصہ ہے جتنا کہ اونچے طبقے کے لوگوں کا ہوتا ہے۔ معاشرتی اقدار میں لوگوں سے گفتگو کا انداز، رہن سہن کا انداز سیکھنے سکھانے کا عمل؛ سیاسی عوامل، اقتصادی عوامل جیسی چیزوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ کسی ایک فرد کو کسی بھی حوالے سے نقصان نہ ہو اس کی دل آزاری نہ ہو۔ وحید احمد اپنے ناول "زینو" میں ارسطو اور زینو کے درمیان بات چیت کیسے ہوتی تھی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"ارسطو نے دیکھا کہ ایک انتہائی حسین و جمیل نوجوان اُس سے ہم کلام ہے۔ وہ دونوں ساحل پر چلنے لگے جب نوجوان پر کھلا کہ وہ ارسطو کے ساتھ چل رہا ہے تو اُسے خوشی ہوئی۔ جب زینو کی علم سے مزین گفتگو نے اُسے اپنی طرف کھینچا تو وہ چلتے چلتے رُک گیا بولا"۔۔۔"دورانِ گفتگو تمہارے ہاتھوں کے اشارے اور لفظوں سے ٹپکتا ہوا علم گواہی دیتا ہے کہ تم میرے ایک ہم جماعت کے بیٹے ہو جو اسی انداز میں مگر ذرا تیز گفتگو کرتا تھا۔"[۵]

ارسطو یونان کا ایک عظیم فلاسفر تھا۔ یونانیوں نے ہمیشہ فلاسفرز کی عزت کی۔ اُن کے ہاں کائنات پر بات کرنے والے زندگی پر بات کرنے والوں کی اہمیت تھی۔ فلاسفرز علم پر بات کرنے والے سے زیادہ محبت رکھتے تھے

اور اُن کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ناول کے اس اقتباس میں بھی ارسطو فلاسفر ایک ذہین نوجوان سے متاثر ہوتا ہے جو بعد میں ایک بڑا فلاسفر بنتا ہے اور پیراڈاکس کی وجہ سے مشہور ہوتا ہے۔ زینو کو زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ ارسطو کے ساتھ چل رہا ہے اس سے بات چیت کر رہا ہے۔ ان کے درمیان علم کی ہی بات ہوتی ہے۔ معاشرے کو ایسے کرداروں کی ضرورت ہوتی ہے جن کی وجہ سے معاشرہ پروان چڑھتا ہے۔ ارسطو جیسے اور فلاسفرز جو حکیمانہ گفتگو میں ماہر تھے انھوں نے بھی معاشرے کی اصلاح علم کے ذریعے کی۔

یونانی تہذیب میں ادب کے حوالے سے سب سے زیادہ اہمیت ہومرؔ کو دی جاتی ہے۔ اس کی دو رزمیہ نظمیں، 'ایلیڈ' اور 'اوڈیسی' ہیں بہادری کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔ سکندر اعظم 'ایلیڈ' نظم اکثر پڑھا کرتا تھا اور اسے اپنے پاس رکھتا تھا۔ ہومر سکندر کا پسندیدہ شاعر تھا۔ قدیم ایتھنز میں ہر چار برس کے بعد ہومر کی نظموں کو بادشاہ اسٹیج پر مختلف کرداروں سے ایک میلے میں ایکٹ کرواتے تھے۔ ناول نگار نے ہومرؔ کی نظم 'ایلیڈ' کے حوالے سے لکھا ہے کہ کس طرح یونان ہومر کی نظموں کو اہمیت کی نظر سے دیکھتے تھے:

> "رات کا کھانا کھانے کے بعد باپ نے دیکھا کہ زینو کے تیور ابھی تک بگڑے ہوئے تھے جب زینو اپنے بستر پر لیٹا تو باپ نے زینو کو راضی کرنے کے لے ہومر کی ایلیڈ گا کر سنانا شروع کی۔ گانے سے پہلے اس نے بہت اونچے جوتے پہنے، لہراتا ہوا فرغل زیب تن کیا اور چہرے پر ماسک سجایا اور وہ روپ دھارا جو ایتھنز کے اداکار تھیٹر میں اختیار کرتے تھے تاکہ دُور دُور تک نظر آسکیں۔ باپ کی آواز اگرچہ سُر میں تھی مگر اس قدر بھیانک اور پھٹی ہوئی کہ زینو نے چلا کر کہا" گانا بند کرو اور آئندہ کبھی گانے کی کوشش نہ کرنا۔""[٦]

ہومر کون تھا اور کس دور میں زندہ رہا اس کی عمر کیا تھی ان سوالات کے جوابات یونانیوں کے پاس بھی نہیں تھے۔ یہ بات بھی طے ہونا ابھی باقی ہے کہ ہومر نامی کوئی شخص تھا بھی کہ نہیں یا فرضی کردار کی طرح یونان میں مشہور رہا۔ ہومر کی نظموں کے حوالے سے حبیب حق لکھتے ہیں:

> "'ہومر' سے مطلب اُس واحد شاعر یا اُن شعرا سے ہے جو "ایلیڈ" اور 'اوڈیسی' کے تخلیق کار ہیں۔ یونانیوں نے واحد شخص ہومرؔ کو اپنی دونوں رزمیہ نظموں کا تخلیق کار تسلیم کیا۔ یہ تو طے ہے کہ ایک رزمیہ شاعر یونان میں ہو گزرا جس کا نام ہومرؔ تھا جو کہ "ایلیڈ" اور 'اوڈیسی' کی تخلیق میں ممتاز رہا ہے۔ ان دو نظموں کا نہ صرف یونان کی تہذیب، ثقافت، معاشرت، مذہب، فلسفہ، تعلیم، ادب اور فنون عالیہ پر گہرا اثر پڑا ہے۔ بلکہ بعد کے یورپی

تہذیب وتمدن پر بھی۔ ہومرؔ بلاشبہ ایک ایسا واحد انسان یا تصور ہے، جس نے ہمیشہ کلاسیکی یونانی تہذیب کو نور بخشا۔"[۷]

ہومر کی نظموں کا تعلق قدیم یونان سے بہت گہرا رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف حکایات کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو ہومر سے پہلے یونان میں تھے۔

کسی معاشرے میں اخلاق وعادات، روابط وسلوک، حسن وسلوک، رہن سہن اصل میں سماجی اقدار ہیں۔ ایک تہذیب کا دوسری تہذیب سے روابط سماجی تعلقات کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ یونانی تہذیب اور مصری تہذیب کے روابط قابلِ ذکر ہیں۔ ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تعاون باہم امداد بہت ضروری ہے:

"کشتی سونے سے بھری ہوئی ہے۔ سونا خالصتاً خالص ہے۔ ملاوٹ کا ایک ذرا بھی اس کی ڈلیوں میں نہیں ہے۔ سوائے اس ہوا اور روشنی کے جوان کی سطح پر بیٹھ کر چمک دیتی ہے۔ تم یہ سونا لے لو اور واپس چلے جاؤ اگر تم مصر میں داخل ہو گے تو مصری تمہارے سر پر فرعون کا تاج رکھیں گے۔ جس کی وجہ سے تمہاری رعونت دوچند ہو جائے گی اور تمہاری وحشت کو دوآتشہ کر دے گی۔ قتل وغارت کا آسیب تمہارے تھکے ہوئے دماغ میں پھر سے جوان ہو گا اور تم ان دیکھے علاقوں میں دہشت گردی کے لیے نکل جاؤ گے۔"[۸]

سکندر یہ چاہتا تھا کہ اس کے تعلقات مصریوں سے بہتر سے بہتر ہوں اور سونے سے بھری کشتی مصر لے جائے اور اپنی عزت اور ناموری میں اضافہ چاہتا تھا۔ لیکن زینو ایک ذہین فلاسفر تھا وہ ہمیشہ سکندر کو اچھی باتوں کی تلقین کرتا تھا۔ اس بار بھی اس نے سکندر کو منع کیا کہ اس طرح تم تکبر میں آ جاؤ گے کیونکہ تم مصریوں کی بے بہا محبت سے بگڑ بھی سکتے ہو۔ تم مزید قتل وغارت پہ اتر آؤ گے۔ لہذا اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھو۔ اور واپسی کا رستہ لو۔ اسی میں یونانیوں کی بہتری ہے۔ سکندر کے فوجی جوان اس کے حکم پہ تیار ہوتے تھے۔ زینو کو خطرہ محسوس ہو گیا تھا کیونکہ سکندر اعظم کو جنگ کرنا اور علاقوں کو فتح کرنے کا نشہ ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے یونانی افواج کے جوان جنگ کے دوران مرتے جا رہے تھے۔ اور یہ سب زینو کو پسند نہیں تھا۔

دورِ قدیم میں عورتوں کا کام گھر کو سنبھالنا تھا اور وہ مویشیوں کی دیکھ بھال بھی کرتی تھی۔ فصل کی کٹائی میں مردوں کا ہاتھ بھی بٹاتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سلائی کڑھائی وغیرہ بھی کر لیتی تھیں۔ شادی غمی کی

رسومات میں بھی شریک ہونے کے لیے تیار ہوتی تھیں۔ قدیم دور میں عورتیں ٹولیوں کی صورت میں کسی ماتم میں شریک ہونے کے لیے جاتی تھیں۔ یہ رجحان آج بھی کئی دیہات ، گاؤں اور کچھ شہروں میں بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ زندگی اور موت کا نظام اس کائنات کا ایک جز ہے۔ یونانی خواتین کس طرح کسی میت پہ روتی تھیں ناول نگار نے یونانی تہذیب کی منظر کشی ہومرؔ کی نظم 'ایلیڈ' میں ہیکٹر کی موت میں ہوئی تھی؛ ارسطو نے سکندر کو سنائی:

> ”سکندر کو عورتوں کے بین سنائے گئے۔ جو انہوں نے ہیکٹر کی بے حرمت لاش کو دیکھ کر کئے۔ ہیکٹر کی ماں نے جب آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے الفاظ لبوں سے انڈیلے تو جواب میں عورتوں نے چیخیں بلند کیں ہیلن نے بھی لاش پر بین کیا۔ ہچکی کے جھٹکوں میں ڈوبی ہوئی سانسوں اور رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں میں ہیکٹر کو تدفین کے حق سے نوازا گیا۔“[9]

ہومرؔ کی نظم میں ٹرائے کی جنگ کا موضوع ہے ۔ کئی دنوں سے ارسطو ہومرؔ کی نظم 'ایلیڈ' سنا رہا ہوتا ہے۔ جس دن اس نظم کا بیسواں باب پڑھ رہا ہوتا ہے۔ جس میں اکلیس بہادر سپہ سالار ہے اور بہادر ہے ٹرائے کے سپاہیوں کو مارتا جاتا ہے۔ اس باب میں ٹرائے کا سپہ سالار جس کا نام ہیکٹر ہوتا ہے۔ اکلیس سے لڑتے لڑتے اپنی شکست کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اکلیس کے برچھے سے ہیکٹر بہت زخمی جاتا ہے اور آخر کار مر جاتا ہے۔ ارسطو نے نظم جاری رکھی اور عورتوں کے بین بھی سنائے جو عورتوں نے ہیکٹر کی لاش پہ روتے ہوئے کیے تھے۔ کس طرح ہیکٹر کی ماں نے درد بھرے لفظوں سے اپنے بیٹے کی لاش کو دیکھا۔ جس پر عورتوں نے بین کیا۔ اور کس طرح اس کی تدفین ہوئی ہومرؔ نے اپنی نظم 'ایلیڈ' میں سب منظر رقم کیے ہوئے تھے جسے ارسطو پڑھ کے سکندر اعظم کو سنا رہا تھا۔

کسی سماج کا امتحان اس معیار پر دیکھا جا سکتا ہے کہ مرد اور اس کا مقام اس معاشرے میں کیسا ہے ؟یعنی اس معاشرے میں انسانی عزت و شرف کا تحفظ ہے کہ نہیں ہے موجودہ دور میں بھی اس نظام میں خرابیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ عورت گھر رہے، نوکری پہ جائے یا سکول کالج پڑھے اسے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

> ”ایما تمہاری زینو کے ساتھ رفاقت کو چھ ماہ ہو گئے مگر تم ابھی تک امید سے نہیں ہو۔ تمہیں تو یہاں کے رسم و رواج کا علم ہے ۔ اگر چہ ایتھنز روشن خیال علاقہ ہے مگر یہاں بھی

مقدونیہ کی طرح اُن عورتوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے جو بچہ پیدا نہ کر سکیں۔ کیا زینو نے اس بارے میں کچھ کہا ہے؟"[۱۰]

ایما ایک خوبصورت لڑکی ہے جس کا تعلق زینو کے ساتھ ہے یعنی وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ ایما کی ماں اسے کہتی ہے کہ تمہارا زینو سے تعلق چھ ماہ ہو گیا ہے کوئی بچے کی خوش خبری نہیں دی تم نے کیونکہ یونان میں جنسی تعلقات کوئی بڑی بات نہیں ہوتی تھی۔ یعنی کوئی روک رکاوٹ نہیں ہوتی تھی ایسے تعلقات وہ لوگ عورتوں سے رکھتے تھے۔ اسی لیے ایما بھی زینو کی دوست تھی اور اس کے ساتھ جنسی تعلقات رکھ چکی تھی۔ اور ایتھنز شہر جہاں وہ رہتے تھے اس شہر کا یہ قانون تھا کہ مرد عورت کے درمیان اگر چھ ماہ کا تعلق گزر جائے اور کوئی اولاد کے آثار نظر نہ آرہے ہوں تو اُن دونوں کو علیحدگی اختیار کرنی ہوگی کیونکہ کہ یہ مقدونیہ کا قانون ہے اور یہاں بھی لاگو ہے۔ ایما کی ماں اس حوالے سے پریشان تھی کہ کہیں زینو اس کی بیٹی کو چھوڑ نہ دے۔

تمدن کسی دور یا کسی نسل کے معاشروں کی ثقافتی سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ان کے جذبات و احساسات اور افکار و نظریات پر روشنی ڈالتی ہے۔رہن سہن کے طور اطور دور قدیم سے چلا آ رہا ہے ۔ اپنی ضرورت کے مطابق لوگوں نے معاشرے میں کسی نہ کسی حوالے اپنے حصے کا کام کیا ہے۔ قدیم یونان میں ذہین لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ رہن سہن، سماجی رشتے، اخلاق و عادات، پیار محبت کا تعلق اور خاندانی پس منظر اور ان سے گہرے تعلقات کی قدیم دور میں بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ یونانی لوگ رہنے کے لیے گھروں کا بندوبست بھی مقامات کے موسموں کو دیکھ کر ہی کرتے تھے۔ اور جنگلی جانوروں سے بچاؤ کے لیے ضروری اقدامات کرتے تھے۔ وحید احمد ناول میں زینو کے گھر کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

"ہفتے عشرے میں پتھر کی دیواروں کا گھر بنایا گیا جس کے دو کمرے تھے۔ چھت لکڑی کی تھی بڑے کمرے میں ماں باپ رہتے تھے۔ زینو کا کمرہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ جب باپ نے ایک مضبوط کواڑ بنانے کا منصوبہ بنایا تو زینو نے مخالفت کی، جب باپ نے جنگلی جانوروں اور حشرات الارض سے حفاظت کی دلیل دی۔"[۱۱]

زینو کے باپ نے گھر کی دیواروں کے لیے پتھروں کا استعمال کیا اور پتھروں کا استعمال یونانیوں نے عمارات کے لیے بہت استعمال کیا ہے اور یونانی فن کار اس حوالے سے بہت مہارت رکھتے تھے۔ دیواروں کو

پتھروں سے تعمیر کرنا اُن پر نقش و نگار بنانا اُن کے تہذیب میں شامل تھا۔ اٹھارویں صدی قبل از مسیح انھوں نے مٹی کے پائپ تیار کیے اور انھیں زیرِ زمین بچھایا گیا اور جس کے ذریعے صاف پانی لایا جاتا تھا اور گندہ پانی باہر نکالا جاتا تھا۔ یعنی فلش سسٹم کا آغاز انھوں نے کر دیا تھا۔ زینو کے باپ نے دو کمروں کا گھر تعمیر کیا جس کی چھت لکڑی تھی۔ زینو کا کمرہ اگلی طرف تھا جس کے لیے ایک مضبوط لکڑی کے کواڑ کی ضرورت تھی کیونکہ حفاظتی اقدامات بھی ضروری تھی۔ زینو کے انکار پر اس کے باپ نے اسے جنگی جانوروں اور خطرناک کیڑوں مکوڑوں سے بچنے کے لیے دروازہ لگانے کے لیے زور دیا۔

معاشرے میں سماجی قدروں سے سماج کی بقا ممکن ہے۔ اگر قدروں کی تحفظ نہ کیا جائے تو غلط راستوں پر چلنے سے معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ وحید احمد لکھتے ہیں:

"مخروطی جام بھر ہوئے تھے۔ بیسیوں رقاصائیں ناچ رہی تھیں۔ موسیقی کی دُھن پر جھومتے ہوئے سپاہی دادِ عیش دے رہے تھے۔"[۱۲]

ناول میں پاکستان کے شہر راولپنڈی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس شہر کا تہذیبی حوالے بڑا مقام ہے کیونکہ یہ شہر ٹیکسلا کا ضلع کہلاتا ہے۔

"زینو کے لیے شراب راولپنڈی سے تیار ہو کر آتی تھی۔ تحسین کا ایک دوست مری بروری کا ریٹائرڈ ملازم تھا۔ وہ انگوروں کی وائن بنانے کا ماہر تھا۔ انگوروں کی بیلیں مانسہرہ کے قریب زمین میں اُگتی تھیں جو کھاد سے پاک تھی۔"[۱۳]

زینو جب غرقاب برف سے دوبارہ زندہ ہوتا ہے تو وہ ایشیا میں آتا ہے زینو چونکہ یونان سے تعلق رکھتا تھا اور وہاں شراب وہ شوق سے پیتا تھا اور اسے یہاں پاکستان میں بھی اس کے لیے اس کا بندوبست کرنا پڑا ہے۔ پاکستان کے شہر راولپنڈی بھی بہت پرانا شہر ہے اپنے اندر قدیم تہذیبیں بسائے ہوئے ہے۔ جہاں زینو آیا ہوا ہے وہ ٹیکسلا راولپنڈی کی تحصیل کہلاتا ہے۔ راولپنڈی ایک مقام مری بروری جہاں مختلف مشروبات کے ساتھ ساتھ شراب بھی تیار ہوتی ہے۔ وہاں کے ایک پرانے ملازم سے خصوصی طور پر زینو کے لیے شراب تیار کی گئی ہے۔

قدیم دور کا مطالعہ بہت ضروری اور اہم ہوتا ہے کیونکہ پرانے دور کی تہذیبی و ثقافتی اشکال و اعمال کے مطالعے سے ایسے واقعات و معلومات مہیا ہوتے ہیں۔ جن سے اس دور کی سماجی اقدار کو سمجھنے میں مدد ملتی

ہے۔قدیم دور کے رہن سہن نقش و نگار سے اس دور کے نسل انسانی کے بارے میں پتا چلتا ہے کہ وہ کس طرح کے لوگ تھے اور کیسے دکھتے تھے۔جدید تہذیب میں نئی ایجادات مثلاً کیمرہ، برقی موصلاحات، جہاز، ریڈیو وغیرہ سے پرانے دور کی بھی آگہی حاصل ہوتی ہے۔اس سلسلے میں وحید احمد اپنے ناول میں اپنے کرداروں سے یہ بات کہلواتے ہیں:

"اگر ہم سو سال پہلے کی کیمرہ فوٹو یا فلم دیکھیں تو کیا ہمیں گزشتہ لوگ ذرا مختلف نظر نہیں آتے ؟اُن کی نشست و برخاست ،ان کے چہرے کے تیور، ان کے دیکھنے کا انداز، اُن کی آنکھوں کا تحیر۔اُن کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکان کا خم، گردن پر چہرے کا زاویہ، سر کے بالوں کے پیچ و خم ،پیشانی پر اجنبی انداز میں پھیلے ہوئے بل اور سلوٹیں اور لباس تو خیر مختلف ہوتا ہی ہے۔وہ الگ بات کہ ان تصویروں اور فلموں کے جانور پرندے ہمیں اُسی طرح نظر آتے ہیں جیسے وہ آج موجود ہیں اگر سو سال پہلے کے لوگ اتنے مختلف ہو سکتے ہیں تو ہزاروں سال پہلے کا یہ شخص یقیناً مختلف ہونا چاہیے۔وہ تو اس کا کرم ہے کہ حیرت ناک حد تک نظر نہیں آتا بلکہ اگر غور نہ کیا جائے تو کوئی خاص مختلف نظر نہیں آتا۔"[۱۴]

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں قدیم دور کی معلومات انسانی شکل وصورت اوران کے رہن سہن سے متعلق آگہی حاصل ہوتی ہے اور ناول نگار مختلف ادوار اور علاقوں کے تہذیبی عناصر میں سے ایک بنیادی عنصر "سماجی اقدار" پر فکشن کے پیرائے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے مکالمے کے انداز میں مختلف تہذیبوں کے فرق کو واضح کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کس طرح زندگی کے بارے میں مختلف زاویۂ نظر ایک انسان کو دوسرے انسان سے مختلف بناتا ہے اور مختلف نقطۂ نظر اور جہاں بینی کے مختلف تصورات کے انسان کے طرز عمل ، اخلاقی اقدار، سماجی برتاؤں اور معاشی، معاشرتی میں تغیر واضح کرتے ہیں یہاں تک کہ دو مختلف ادوار اور دو مختلف علاقوں کے رہنے والے لباس تک میں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور لباس کا یہ اختلاف صرف ظاہری حد تک لباس کا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ دو تہذیبوں کی سماجی اقدار میں علامتی مدفاصل بھی ہوتا ہے۔

عوام کی منشا اور ضروریات کا اظہار اصل میں دستور سازی ہے اور یہی راستہ ایک بہترین سیاسی نظام کے لیے ہوتا ہے۔انتظامیہ اور قانون یعنی عدلیہ عوام کے رہنما ہوتے ہیں ۔عوام اپنے حقوق کے لیے اپنے نمائندوں سے رجوع کرتے ہیں۔ول ڈیورانٹ نے اس حوالے سے لکھا:

"مستقل سماجی تنظیم کی سب سے ابتدائی شکل ایک جتھا تھا۔ رشتہ دار خاندانوں کا ایک گروہ جو مشترکہ زمین کے ایک ٹکڑے پر قابض تھا، جس کا ایک ہی ٹوٹم (Totem) اور ایک جیسے رواج و قوانین تھے۔ جب جتھوں کا ایک گروہ آپس میں ایک سردار کے ماتحت اکٹھا ہوتا تو ایک قبیلہ وجود میں آتا جو سٹیٹ کی راہ میں دوسرا قدم ہوتا۔ لیکن یہ ایک سُست رفتار ارتقا تھا۔ کئی گروہوں کا کوئی سردار نہیں تھا اور بہت سارے گروہ اپنے سردار کو صرف جنگ کے وقت برداشت کرتے۔ جمہوریت جو ہمارے عہد میں ایک زوال پذیر نظام ہے۔ غیر متمدن قبائل میں بہترین شکل میں پائی جاتی تھی۔"[۱۵]

سماجی صورتوں میں انسان کے حالات کچھ اس طرح تھے کہ شکار کی صورت میں یا کسی مشکل حالات میں وہ سیاسی تنظیم قائم کر لیتے تھے۔ مختلف سماجی تنظیموں کے ساتھ مل کر سیاسی عمل میں اپنا کردار ادا کرتے تھے۔ سماج اور سیاست کا عمل خاندان، ملکیت اور ریاست کے تصورات مضبوط کرنے کے لیے نئے ذرائع پیدوار کی تلاش جاری رکھتے۔ سیاست اور سماج کا تعلق الگ تصور نہیں کیا جاسکتا۔ تہذیبی اعتبار سے دیکھیں تو کسی بھی دور میں ان مین کوئی حقیقی افتراق نہیں تھا۔

ii۔ گندھارا تہذیب:

گندھارا ایک قدیم تہذیب کا نام ہے جسے ریاست بھی کہا جاتا ہے۔ جس میں راولپنڈی، اٹک، وادی سوات، وادی کابل اور پشاور کے اضلاع اور علاقے شامل رہے ہیں۔ اس تہذیب کا عروج پہلی صدی عیسوی سے ساتویں صدی عیسوی تک رہا ہے۔ ٹیکسلا میں چندر گپت موریہ کے عہد میں ایک نمایاں تعلیمی مرکز تھا جہاں ایک بڑی یونیورسٹی قائم تھی۔ جہاں دُنیا بھر سے لوگ پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ اس علاقے میں مجسمہ سازی کے ایک مخصوص انداز کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ مجسمہ سازی کے فن میں رومی اور یونانی فن سے استفادہ حاصل کیا۔ گندھارا آرٹ کی ترویج میں کشن دور کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ گندھارا تہذیب کو آرٹ کا نام تو دیا گیا مگر صرف آرٹ کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک بڑے وسیع علاقوں پہ محیط ایک مکمل تہذیب ہے۔ اس تہذیب کا عروج پہلی صدی سے شروع ہوا۔ گندھارا سے متعلق بہت سے مؤرخین نے تاریخی ادوار کا جائزہ لینے کے بعد لکھا جن میں ولی اللہ خاں گندھارا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"دریائے سندھ سے مغرب کے علاقہ کے علاوہ اس میں کچھ مشرق کا علاقہ یعنی موجودہ ضلع اٹک وراولپنڈی بھی شامل ہو۔ ویدوں کے کچھ عالموں کا خیال ہے کہ رِگ وید میں کچھ ایسے بلاواسطہ حوالے ہیں۔ جیسے گندھارا اور گندھاری۔ جن سے یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ یہ حوالے اضلاع پشاور، اٹک اور راولپنڈی کے علاقوں کے متعلق ہیں۔"[۱۶]

تاریخ میں پشاور، بالیان، سوات اور جلال آباد کے علاقوں میں بے شمار رومی اور یونانی کاری گر تھے۔ گندھارا آرٹ یا فن نے معاشرت کو بھرپور انداز سے پیش کیا ہے۔ گندھارا فن کے تحت مہاتما بدھ کے مجسموں کو یونانی آرٹ کے مطابق بنانے اور ان کی مزید خوب صورتی میں اضافہ کیا۔ ان مجسموں میں اعضا اور لباس کو نمایاں انداز میں پیش کیا گیا:

"یہ تکشا شیلا ہے، جس کی مٹی میں بُدھا کی خوشبو ہے اور جس کی ہوا کے جھونکوں میں مہاویر کا لمس ہے۔ ارسطو سے بہت پہلے بُدھا نے کہا تھا کہ دو انتہاؤں کے درمیان راستی کا راستہ میانہ روی کا سنہرا راستہ ہے۔ یہ راستہ راستی کے آٹھ اصول سمجھاتا ہے۔ یعنی درست خیال صحیح ارادہ، راست گوئی، خوش اسلوبی، عین زندگی، سعی حاصل، شدھ حواسی اور فکر رسا۔۔۔ بُدھا نے نفس کے ساتھ جنگ کی تھی اور نروان پایا تھا نروان باٹنا تھا۔ بدھا کا جسم عمل والی مٹی سے بنا تھا۔ جو دنیاوی آلائشوں سے بلند تھی۔۔۔ تکشا شیلا کی مٹی میں بُدھا کی خوشبو ہے اور اس کی ہوا کے جھونکوں میں مہاویر کا لمس ہے۔ مہاویر نے کہا تھا کہ روح کو کرما کے کرب سے بچانے کے لیے چند پرہیز ضروری ہیں یعنی قتل، چوری، جھوٹ، جنسی بے راہ روی اور ذاتی ملکیت سے پرہیز۔"[۱۷]

بت تراشی کا فن بُدھ مذہب کا ایک لازمی جز تھا اور مذہبی ضرورت کے تحت اسے بے مثال ترقی ہی حاصل نہیں ہوئی بلکہ عزت بھی ملی۔ بُدھ مذہب کی عبادت گاہوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اسی مناسبت سے فن کے ماہروں کی بھی مانگ میں اور قدر بڑھتی رہی۔ گوتم بدھ کے حوالے سے ولی اللہ خاں لکھتے ہیں:

"تاریخ ہمیں نہیں بتاتی کہ مہاتما گوتم بدھ نے کبھی گندھارا کی سرزمین پر قدم رکھا ہو مگر مذہبی غلو اور جوش نے یہ عالم کر دکھایا۔ کہ اس سرزمین کے پہاڑ، پہاڑیاں، غاز، وادیاں،

دریا، چشمے وغیرہ وغیرہ معمولی شکل کے پتھر اور غیر معمولی بڑے درخت سب ہی کو مہاتما بُدھ کی زندگی یا گزشتہ جنم کے واقعات یا بُدھ مذہب کے آنے والے واقعات سے منسوب اور منسلک کر دیا اور اس سرزین کے پہاڑوں، وادیوں اور ہر اہم و خوبصورت مقام کو بُدھ مذہب کی عبادت گاہوں کی تعمیر سے معمور کر دیا جن کے ویرانوں سے آج بھی گندھارا کی سرزمین بھری پڑی ہے اور جو ہر شاہراہ پر دور وسے نظر آتے ہیں اور ہر دیکھنے والے کو اپنی داستانِ عبرت سناتے ہیں۔ یہ ہی نہیں بلکہ شاہراہوں پر مہاتما بدھ اور بودھی ستواؤں کے بت ہر اہم مقام پر نصب کر دیئے گئے یا پہاڑ کو کاٹ کر یہ شکل دے دی گئی تھی۔"[۱۸]

گندھارا تہذیب اس بدھ دور میں بہت خوشحال تھی اس کے بعد آج تک اسے وہ دور نصیب نہیں ہوا۔ اس کی ہواؤں اور فضاؤں میں دن رات بدھا کے علاوہ کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بدھ مذہب کی عبادت گاہوں کی سریلی گھنٹیوں کی آوازوں کے سوا اس کی کوئی اور موسیقی سننے کو نہیں ملتی تھی۔ اس مذہب میں بھکشوں کے لباس کی زردی کے علاوہ اس ملک کو کوئی اور رنگ بھی نہیں ہوتا تھا۔

جب سکندر اپنے ملکہ رخسانہ کے ساتھ ٹیکسلا آیا تو دور دراز کے لوگ باجوڑ، خیبر اور دوسرے علاقوں سے اسے خوش آمدید کہنے پہنچ گئے۔ لوگ بہت بے تاب تھے کہ ایک جھلک سکندر کو دیکھ سکیں۔ ایما سکندر سے ملی اور اس نے کہا کہ یہ ٹیکسلا ہے اور یہاں آج بھی بدھا کی چاہت کے پھول کھلتے ہیں اور اس کی خوشبو چار سو پھیلی ہوئی ہے اور یہاں بدھا کی محبت کے علاوہ مہاویر کا لمس بھی محسوس کیا جاتا ہے۔ مہاویر بھی بدھا کی طرح اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ یعنی گوتم بدھ مت اور مہاویر جین مت کو پھیلانے والے تھے۔ گوتم کی طرح مہاویر نے بھی فقیرانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔ ایما ان دونوں کی خصوصیات کے حوالے اسے بتاتی ہے۔ یعنی وہ امن کا درس دیتے تھے۔ وہ بولی کہ ارسطو سے پہلے یہاں کے بُدھا نے سیدھے راستے پر چلنا امن سے رہنا اور میانہ روی اختیار کرنا؛ انسانی زندگی کی قدر کرنا۔ بدھا لوگوں کے ساتھ جنگ نہیں کرتا تھا بلکہ اس نے ہمیشہ نفس سے جنگ کی ہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کی ہے۔ مہاویر کے حوالے سے اس نے سکندر کو بتایا کہ تونے آدھی دُنیا کو فتح کر لیا اور کیا پا لیا۔ مہاویر نے قتل، چوری، جھوٹ، جنسی بے راہ روی اور ذاتی ملکیت سے اجتناب رہنے کی ہمیشہ تلقین کی ہے۔ ایما نے سکندر سے کہا کہ یہ باتیں تمہیں بتانا ضروری تھیں کیونکہ تم ٹیکسلا آئے ہو اور یہ سرزمین بُدھا اور مہاویر کی ہے۔

iii۔ سیاسی نظام:

یونان کے استحکام کے لیے افلاطون نے ایک منفرد سیاسی ڈھانچہ پیش کیا۔ اور موجودہ دور میں یونان کے علاوہ فرانس میں انقلاب کے بعد مغربی دُنیا کے ممالک نے افلاطون کے سیاسی نظام کو اپنایا اور آج کے دور میں بھی اُس کے سیاسی نظام کے اصول کو اپنایا جاتا ہے۔ دُنیا کو ایسا نظام دیا جو سیاسیات، اخلاقیات اور علمیات کے درس پر مبنی ہے۔ یونانی افلاطون کی فکر اور سوچ سے ہمکنار ہوئے۔ قدیم یونانی فلاسفہ کے افکار مغرب ممالک کے سیاسی فلسفہ، مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی فلسفہ کا احاطہ کرتا ہے۔ فن اور علم کی طرح سیاسیات بھی آج کل ہر شخص کی دلچسپی پر منحصر ہے کہ وہ اسے پڑھے اسے سوچے اس کی طرف بڑھے۔ اسی لیے دورِ حاضر میں سیاسیات کا وہ مقام نہیں ہے جو قدیم دور میں یونانیوں میں تھا۔ سیاسیاست اُن کی زندگی میں شامل تھی۔ سیاسی نظام کے حوالے سے ہر شخص اپنی رائے رکھتا تھا کیونکہ اس دور میں سیاسیات وسیع پیمانے پہ پھیلی ہوئی تھی۔ ہر فرد کو سیاست کا نالج تھا اس لیے تہذیبی عناصر سے یونانیوں کا گہرا تعلق تھا۔

سیاسی نظام انسانی زندگی کے حوالے سے بحث کرتا ہے۔ایک معاشرہ انسانی زندگی کے گرد گھومتا ہے۔ انسانی زندگی ایک وسیع موضوع ہے جس پر بحث کی جاتی ہے۔سیاسیات کا تعلق باقی علوم معاشیات، اخلاقیات،نفسیات اور تاریخ اور دیگر علوم سے ہمیشہ رہتا ہے۔ انھی علوم سے معاشرہ بنتا ہے۔ معاشرتی زندگی سے متعلق سیاسی نظام کو متحرک رکھنا پڑتا ہے۔یونان کے فلاسفہ کی طرح دوسرے ممالک سے تعلق رکھنے والے فلاسفہ نے بھی سیاسیات کا تعلق دوسرے علوم سے جوڑا ہے۔ ناول زینو میں سیاسی نظام کے حوالے سے ارسطو زینو سے ہم کلام ہوتا ہے:

> ”فلسفہ سوچ کا عروج ہے۔ فلسفی کے مخصوص کردار کی عظمت کو ہم تہذیب و تمدن کے ارتقائی پس منظر سے اخذ کرتے ہیں۔ پانچ درجے ہیں تہذیبی ارتقا کے۔ پہلی سطح پر انسان کی مجبوری ہوتی ہے کہ وہ ضروریاتِ زندگی تلاش کرے تا کہ جیا جاسکے۔ دوسری سطح پر انسان سیاست کے فن کو دریافت کرتا ہے تا کہ تلاش کرے تا کہ جیا جاسکے۔ دوسری سطح پر اُن فنون کی دریافت کا جن دریافت کرتا ہے تا کہ نظام حکومت چلایا جاسکے۔ تیسرا درجہ ہے اُن فنون کی دریافت کا جن سے مہذب اور شائستہ عادات واطوار جنم لیتے ہیں۔ چوتھا درجہ ان فنون کے مناسب استعمال کا ہے جو علم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ جب معاشرہ ان چار مدارج سے گزرتا ہے تو ایک مستحکم ریاست وجود آتی ہے اور زمین فلسفے کے لیے ہموار ہوتی ہے یہ پانچواں درجہ ہوتا ہے۔“[۱۹]

سیاسی نظام نے انسانی زندگی کا نظام ایک ریاست میں متعارف کرایا۔سیاسیات میں اخلاقیات کے علاوہ تاریخ اور دیگر علوم ہوتے ہیں۔ یہ بات مسلم ہے کہ انسان کا معاشرتی اداروں سے تعلق سیاسی نظام کے باعث ہے۔ معاشرے میں مختلف لوگوں کا طرز عمل ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔سیاسی فلسفی مختلف نظریوں، دلیلوں اور مختلف موضوعات کے ذریعے بحث کرتے ہیں۔ اس نظام کے کئی پہلو ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔قدیم یونان میں اس سوال کو بہت اٹھایا گیا جیسا کہ اوپر حوالہ میں درج ہے کہ کس طرح ارسطو اور زینو کے درمیان بات ہوتی ہے۔اس دور میں یہ سوال لوگ کرتے تھے کہ سیاست کا تعلق اصل میں کس چیز کے ساتھ ہے۔؟کیا سیاست فلسفہ ہے؟علم ہے یا فن ہے؟سیاسیات اگر علم ہے تو اس کا مطالعہ یقیناً فنی اور فلسفے کے پہلو پر ہونا بہت ضروری ہے۔سیاسی نظام میں سے علمی اور فنی پہلو کو نکال دیا جائے تو سیاسی ڈھانچہ ایک خالی نام کا رہ جاتا ہے۔جس میں کوئی نظام نہیں ہوتا ہے۔علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:

> ”ارسطو کو دنیائے فلسفہ میں منطق،جمالیات،اخلاقیات اور سیاسیات کا مدون سمجھا جاتا ہے۔اخلاقیات میں اس نے اعتدال کا نقطۂ نظر پیش کیا۔وہ کہتا ہے کہ انسان بالطبع مسرت کا طالب ہے اور اعلیٰ مسرت صرف فلسفیانہ تفکر و تعمق ہی سے میسر آسکتی ہے۔اُس کے خیال میں اخلاق اور سیاسیات باہم گر وابستہ ہیں۔جو شخص شہری نہیں ہوسکتا وہ بااخلاق نہیں ہوسکتا۔“[۲۰]

سیاسیات میں فلسفے یعنی غوروفکر کی ضرورت ہوتی ہے۔جس سے ایک ریاست وجود میں آتی ہے۔ریاست سیاسی نظام کو چلاتی ہے۔فلاسفر کے نزدیک ریاست کا مفہوم مختلف ہوتا ہے ریاست وقت کے ساتھ ساتھ اپنے اندر تبدیلی رکھتی ہے۔دورِجدید میں اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔تہذیب میں مختلف مذاہب کے پیروکار ہوتے ہیں۔جن کی وجہ سے مختلف لوگ آکر بستے ہیں۔معاشرے اور ریاست میں فرق ہے معاشرہ ایک جماعت کی صورت سامنے آتا ہے جو کہ غیر منظم ہے جیسا کہ خانہ بدوش لوگوں کا رہن سہن ان کے طور اطوار بول چال،سوچ و فکر وغیرہ جب کہ ریاست میں رہنے والا ایک منظم طریقے سے رہتا ہے یعنی ریاست کو ایک حکومت چلاتی ہے جس میں ایک سیاسی نظام لایا جاتا ہے۔ایک خاص سوچ اور فکر رکھنے والا حکومتی سربراہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارسطو نے کہا کہ بادشاہ کو بھی حکومت چلانے کے لیے فلسفی کی طرح سوچنا ہوگا۔فلسفے کے علم کی بنیاد پر اسے آگے بڑھنا پڑے گا۔حکومت نے ریاست کے اندر فنون وعلوم کا خاص خیال رکھنا ہوتا ہے کیونکہ مختلف علوم سے انسانی

زندگی کو سمجھا جا سکتا ہے۔ انسان اور جانور میں فرق علم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ضروریاتِ زندگی، سیاسی نظام میں فن کا استعمال، علوم و فنون کا جاننا اور بود و باش، رہن سہن، طور اطوار سے معاشرہ مستحکم ہو کر ریاست کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یعنی یونانی فلسفی ارسطو اس بات پہ بضد ہے کہ سیاسی نظام کے لیے ہمیں فلسفے کا جاننا ضروری ہے:

> ”ہم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ یونان دُنیا کی تاریخ کا زریں ترین باب ہے اور دُنیا کا مہذب ترین علاقہ ہے، مگر باقی تہذیبیں بھی یہی کہتی ہیں۔ دارا اول کی سلطنت جو وادی سندھ سے مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ اپنے آپ کو انتظامی صلاحیتوں میں بے مثل سمجھتی تھی۔ اس کے تیئس صوبوں میں صوبے دار روافسر محاصل انتظامی امور کے ماہر تھے۔ دارا اول کی سلطنت میں بلند ستونوں والی قابلِ دید عمارات اور سڑکیں بنیں۔ وادی سندھ میں موہنجو داڑو اور ہڑپا کے شہر وقت کی جدید ترین سہولتوں سے آراستہ تھے۔“[۲۱]

اس میں کوئی شک نہیں ہے یونانی تہذیب دُنیا کی قدیم ترین اور بیش قیمتی تہذیب ہے اور سیاسی حوالے سے بھی انتظام منظم ہوتے تھے۔ مگر دارا کے دور میں بہت سی بغاوتیں ہوئیں اور دارا اول نے اپنی سلطنت کو نئی صوبوں میں تقسیم کیا اور ہر ایک صوبے میں ایک ایک حاکم بھی مقرر کیا جو اپنے اپنے صوبے کے سیاسی امور کو دیکھتا تھا۔ اس کے علاوہ دارا اول نے عدالتی نظام بھی قائم کیا تا کہ انصاف کا نظام بھی لایا جا سکے۔ ایران کی تاریخ میں پہلا بادشاہ تھا جس نے سونے اور چاندی کے سکے بھی جاری کیے۔ اس نے اپنی حکومت کے دوران مواصلاتی نظام بھی بنایا، سڑکیں تعمیر کروائیں اور فوجی چوکیاں بھی بنائیں تا کہ سیکورٹی تحفظ بھی لوگوں کو دیا جا سکے۔ فرعونِ مصر نے جو نہر کھدوائی تھی اُس کو دارا نے دریائے نیل کے ساتھ ملانے کا کام بھی سر انجام دیا تا کہ افریقہ اور ایشیا میں تجارتی نظام بن سکے۔

وادی سندھ جو کہ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ شمال سے جنوب تک پھیلی ہوئی تھی اور اپنے عروج پر تھی۔ ہڑپہ اور موہنجو داڑو کے شہر اس تہذیب کے خاص مرکز تھے۔ دریائے سندھ کی تہذیب کا انکشاف بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اس وقت ہوا جب آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈائریکٹر جنرل سر جان مارشل کی زیر نگرانی تحقیقات کا آغاز ہوا اور یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ شہر تقریباً ۵۰۰۰ سال پرانا ہے۔ یہاں بھی جدید شہروں جیسے بازار، سڑکیں اور نکاسی کا نظام موجود تھا۔ یہ شہر ہڑپہ کی تہذیب کہلاتا ہے۔ سندھ تہذیب کے حوالے سے جو کھنڈرات پائے جاتے ہیں۔ ان سے اُن کی تہذیب کا پتا چلتا ہے۔ وادی سندھ کے لوگ اپنے لیے

تمام برتن مٹی کو آگ پر پکا کر بنا لیتے تھے۔ اور مکانوں کے لیے بھی اینٹوں کا بندوبست وہ مٹی کو آگ پر پکا کر استعمال میں لاتے تھے۔ آگ کا استعمال بہت زیادہ ہوتا تھا۔ جس سے ایک حادثہ بھی رونما ہوا تھا دو قلعہ بند اور شہر آمری اور کوٹ ڈیجی آگ سے جل کر تباہ ہو گئے تھے۔ یہ آگ برتنوں اور مکانوں کی اینٹیں بناتے ہوئے بھٹوں سے پھیلی تھی۔ مگر وادی سندھ کے لوگوں نے پھر ہمت باندھی اور پھر نئے شہر آباد کیے۔ اس طرح ترقی کے پھر راستے کھلے اور دو بڑے شہر جو ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے اُن میں پنجاب میں ہڑپہ اور سندھ میں لاڑکانہ کے قریب موہنجوداڑو دریافت ہوئے۔ اس دور میں وہاں شہر، قصبے ایک ہی طرح کے سکیم اور نقشے کے مطابق بنے ہوتے تھے۔ گلیاں کشادہ سڑکیں کھلی اور ہر شہر کا مغربی حصہ چبوترے کی طرح تھا اور ہر حصہ موٹی دیواروں کے گرد مضبوطی سے کھڑا تھا اور دیواروں میں برج بھی بنائے ہوئے تھے جن سے دور دراز کے مقامات کو دیکھا جا سکتا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وادی سندھ کے لوگوں کی سیاسی زندگی بھی بہت منظم تھی۔ ان لوگوں کے سیاسی تعلقات تجارتی حوالے سے عراق اور ایران کے مختلف شہر کے لوگوں سے تھے۔ وادی سندھ کے لوگ مٹی سے بنائے ہوئے خوب صورت برتن عراق اور ایران کے مختلف شہر میں بھیجا کرتے تھے۔ اس طرح تجارت کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان سیاسی تعلقات بھی بہت اچھے رہتے تھے اور ان کا ملنا جلنا بحری راستوں کے ذریعے ہوتا تھا۔

سیاسی مشاورت کی اہمیت اس بات سے لگائی جا سکتی ہے کہ ملک اور علاقوں کے مسائل جو سماجی، ثقافتی، معاشی اور دوسرے شعبوں کے ہوتے ہیں انھیں حل کرنے کے لیے حکومتی سربراہ کی اپنی سیاسی ٹیم سے مشاورت ضروری ہوتی ہے کیونکہ انھیں مل کے کام کرنا ہوتا ہے اور ملکی مفاد کی خاطر مختلف اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔ جیسے یونانی شہنشاہ سکندر نے اپنے استاد اور وزیر ارسطو سے مشاورت کی اور پھر دارا دوم کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تھا اور پہلے ہی حملے میں اسے قتل کر کے بہت سے علاقوں کو فتح کیا تھا اور اپنے نانا اور ماں کا اُس خاندان سے بدلہ بھی لیا تھا۔ ناول میں یونان کی تہذیب کا موازنہ ایشیا کے شہری ریاستوں سے کس طرح ناول کے کردار کرتے ہیں:

> "یہ کتاب حکومت کے اسرار و رموز سے متعلق ہے۔ میں یونان کی شہری ریاستوں کا موازنہ مشرقی ایشیا کی سلطنتوں سے کر رہا ہوں۔ ایک مرکزی ریاست کا خواب پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں چندر گپت موریہ کا دوست اور مشیر خاص ہوں۔ ہم دونوں کو نندا سے ریاست بدر کر دیا گیا ہے۔ جس کا صدر مقام پاٹلی پتر ہے۔۔۔ میں نے سکندرِ اعظم کے

معرکوں کے متعلق بہت کچھ سن رکھا ہے۔ آج کل چندر گپت موریہ بھی ٹیکسلا میں ہے۔ہم دونوں سکندر کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔جو ایک آدھ دن میں یہاں پہنچنے والا ہے۔دراصل سکندر کی لشکر کشی نے قریب قریب تمام دُنیا کو وحدت میں پرو دیا ہے اور اس طرح ایک عظیم عالمی حکومت وجود میں آئی ہے۔"[۲۲]

مذکورہ بلا کتاب سے مراد ارتھ شاستر ہے جس کا مصنف ناول کا ایک کردار چانکیہ ہے جو سیاسی حوالے سے بات کر رہا ہے۔کوٹلیہ چانکیہ ٹیکسلا یونیورسٹی کا استاد تھا اور اسی یونیورسٹی سے پڑھا ہوا تھا۔چانکیہ کی کتاب ارتھ شاستر ایک سپاہی کی کہانی ہے جس میں ایک شخص نے اسے بے سروسامانی کے عالم میں دنیا کی ایک سلطنت کا حکمران بنا دیا۔یعنی وہ عام شخص وہ خود چانکیہ ہے اور وہ سپاہی چندر گپت موریہ جو بے سروسامان پنجاب سے آیا تھا۔یہ کتاب علم سیاسیات کی ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔چانکیہ کو بھی افلاطون کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ارتھ شاستر کا ترجمہ "سیاسیات کی سائنس" کے نام سے کیا ہے۔اسی لیے چانکیہ نے یونان کی ریاستوں کا موازنہ مشرقی ایشیا کی ریاستوں سے کرنے کی بات کی تھی کیونکہ وہ سیاسی نظام کے حوالے سے بات کرنا خوب جانتا تھا۔جس طرح یونان میں افلاطون سے مشاورت کی جاتی تھی اسی طرح ٹیکسلا میں چانکیہ کا نام تھا۔اسی لیے چندر گپت موریہ نے اسے اپنا وزیر چنا تھا اور اس نے ہندوستان کی تاریخ میں سب سے پہلی اور بڑی سلطنت موریہ کی داغ بیل ڈالی۔اس سلطنت کے لیے اس کے وزیر چانکیہ نے خصوصی طور پر حکومت کے حوالے سے سیاسی نظام، انتظامی حوالے سے اور اقتصادی ذرائع کے لیے آرتھ شاستر کتاب لکھی تھی۔موریہ نے صوبہ سرحد کے بہت سے علاقے سندھ اور بلوچستان کے انتظامیہ مہاراجوں اور راجاؤں کو سونپے ہوئے تھے جن سے موریہ زرعی ضروریات حاصل کرتا تھا۔چندر گپت موریہ کے دور میں لوگوں کو سماجی اور زندگی کی ضروریات کے حوالے سے بہت ترقی ہوئی تھی۔زراعت میں بہت فائدہ ہوا جس شہری زندگی بہت خوشگوار تھی۔سکندراعظم کے جانشین سیلی وکس نے میگ تھینز کو یونانی سلطنت کی طرف سے ایلچی کے طور پر چندر گپت کے ہاں بھیجا ہوا تھا۔میگ تھینز کے مطابق چندر گپت کی حکمرانی "پاٹلی پتر" کی آبادی بہت زیادہ تھی۔اور اس دور میں ٹیکسلا بھی ایک اہم اور بڑا شہر تھا۔اس عہد میں وادی سندھ کی جو اجناس دریائے سندھ کے ساتھ تھی وہ فارس کے ممالک کو پہنچائی جاتی رہیں اور دوسرے ممالک سے بھی بہت طلبا اسی یونیورسٹی ٹیکسلا میں علم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔سکندر کے جانشین سیلی

وکس کو دریائے سندھ کے کنارے چندر گپت موریہ نے شکست دی اور پھر سیلی وکس کی بیٹی سے شادی کر کے اسے پاٹلی پتر لے گیا۔ اس رشتے سے یونانیوں اور ہندوستانیوں کے تعلقات بنے:

"تمہیں فوج رکھنے کا شوق ہے۔ تم فوج رکھو، اس کی پرورش کرو، مگر یونان تک محدود رہو تم ایک امیر بادشاہ بن سکتے ہو۔ اگرچہ ارسطو کی طرح میں بھی بادشاہت کے خلاف ہوں۔ شہری ریاستوں کا اصول اچھا ہے۔ مختصر آبادی کی ریاست زیادہ منظم طریقے سے چل سکتی ہے۔ مگر تم حالات کو اس نہج پر لے آئے ہو کہ بادشاہت کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہیں آتا تو ٹھیک ہے۔۔۔ تم ملک یونان کے بادشاہ بنو ،دارا اتنا امیر نہیں ہے۔،جتنے تم ہو جاؤ گے۔بادشاہت اگر امیر ہو تو سرحدیں محفوظ ہو جاتی ہیں اور اندرونِ ملک سکون رہتا ہے۔۔۔تو شرط یہ ہے کہ خزانہ حاصل کرنے کے بعد تم یونان تک محدود رہو گے۔"[۲۳]

سکندر جب چاہتا تھا اپنی فوجی طاقت سے کئی علاقوں کو فتح کر لیتا تھا۔ جس شہر، جس ریاست میں جاتا وہ اس کی فوجی طاقت کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے تھے اور یونان میں شامل ہو جاتے تھے۔ اس حوالے سے زینو نے سکندر سے کہا کہ بے شک تم فوجی طاقت کو بڑھاؤ مگر یونان میں رہو ہر آتے دن تم کسی ملک پر چڑھائی کرتے ہو اس سے سلطنت وسیع تو ہو جائے گی مگر اس کو سنبھالنا بہت مشکل ہو جائے گا اور تمہاری ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ کیونکہ کوئی ریاست اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک اس کا سیاسی نظام بہت اچھا رہتا ہے ۔میں بھی تمہارے استاد ارسطو کی طرح ایسی بادشاہت کا بہت سخت مخالف ہوں۔ ایسی بادشاہت کا کیا فائدہ جو لوگوں کی ضروریات سماجی، معاشرتی، معاشی اور عدل وانصاف کے حوالے سے کوئی منظم طریقے سے حکومت نہ چلا سکے۔ ریاستوں کی سرحدیں محفوظ رکھنی پڑتی ہیں۔ سرحدیں اگر محفوظ رہیں گی تو ملکی دفاع بھی ہو سکے اور معاشرے میں امن وامان ہو گا۔

جب پنجاب میں سکندر نے حملہ کیا تا کہ پنجاب بھی فتح کر کے اس خطے کو بھی اپنی تحویل میں لے۔ کیونکہ اس کی خواہش تھی کہ ساری دُنیا کو فتح کرے۔ لیکن پنجاب میں چندر گپت نے اپنے وزیر چانکیہ کی مدد سے فوج بنائی اور چانکیہ کے مشوروں پہ عمل کرتے ہوئے اُس نے یونانیوں کو شکست دی اور پنجاب کے کئی علاقے فتح کیے یونانیوں کو پنجاب سے باہر نکال کر بادشاہ بن گیا اور ایک منظم سلطنت کی بنیاد رکھی۔ چندر گپت موریہ سکندر کی طرح دنیا کو فتح کرنے کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ اس نے اپنی ریاست میں حکومت کرنی تھی اور اس نے سکندر کی

فوج کو شکست دے کر ثابت بھی کیااور ریاست کو اچھے طریقے سے چلایا۔ لوگوں کا خیال رکھا اُن کی ضروریات کا خیال رکھا، خاص کر کے سیاسی حوالے منظم کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کے لوگ اقتصادی حوالے سے ترقی کی طرف گامزن ہونے لگے۔

زینو نے بھی سکندر کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ یونان تک محدود رہو تاکہ حکومت اچھی طرح سے ہو سکے۔ کیونکہ زیادہ علاقوں میں حکومت کرنا مشکل ہو جاتی ہے:

> "تابناک مستقبل پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کی نظر ماضی کا اتنا عمیق مطالعہ کرے کہ وہ حال کی طرح نگاہوں کے سامنے کھڑا نظر آئے۔ یونان کی تاریخ بہت پرانی نہیں ہے۔ مگر تہذیب و تمدن کے اعتبار سے عروج کے اُس مقام پر ہے جہاں دُنیا یونانیوں اور غیر مہذب بربری بادشاہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ہیروڈوٹس ، تھوسیڈائیڈز اور زینوفان کی تاریخ ہمیں یونانی تہذیب کے نشیب و فراز کا دھندلا سا نقشہ پیش کرتی ہے۔ ہر تاریخ دان کا نقطۂ نظر خارجی ہونے کے ساتھ ساتھ داخلی بھی ہوتا ہے۔ ہیروڈوٹس کے بیان میں مذہب اور علاقائی رسومات کا گہرا رنگ ہے۔ تھوسیڈائیڈز یونان کی اندرونی کشمکش کا مشاہدہ زیادہ گہرائی سے کرتا ہے۔ زینوفان چونکہ خود فوجی تجربہ کار تھا۔ اس لیے اس کا بیان جنگی معرکوں سے مزین ہے،اگر ہم تاریخی موضوع پر ان تمام تحریروں اور یادداشتوں کا موازنہ کریں تو حقیقت کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔ حقیقت کی تلاش ایک سنگلاخ عمل ہے۔"[۴۴]

زینو کو سکندر کا طرزِ عمل پسند نہیں تھا۔ سکندر کو اس بات کی طرف اشارہ بھی کرتا کہ تم جو کام کرتے ہو وہ کام درست نہیں ہیں۔ قتل و غارت اور ہر کسی کے علاقے پر قبضہ کرنا۔ زینو سکندر کو اس بات کی بھی نشان دہی کرتا ہے کہ دیکھو یونان کی تاریخ اتنی پرانی نہیں ہے کہ تم پرانے نشیب و فراز کو بھول جاؤ۔ ہیروڈوٹس، تھوسیڈائیڈز اور زینوفان کی تاریخ سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے۔ مذہبی رنگ ہمیں ہیروڈوٹس سے ملتا ہے۔ اور تھوسیڈائیڈز سے یونان کی داخلی حالات کو درست کرنے کی تگ و دو کا سبق ملتا ہے۔ اس طرح زینوفان جو کہ ایک فوجی تھا اس کے حوالے سے جنگی معرکوں کے سوا کچھ نہیں ملتا ہے۔ اس لیے ہمیں یونان کی تاریخ کو یاد رکھنا

چاہیے تاکہ ہم آج کا وقت اور آگے آنے والے وقت کو ایک منظم طریق سے گزار سکیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم سوچ سمجھ کے آنے والے معاملات کو دیکھیں۔

iv۔ اقتصادی ذرائع:

اقتصادیات میں انسان کے اُن ارادی کاموں کو دیکھا جاتا ہے۔ جن کا ربط روزمرہ زندگی کے محرکات سے ہے۔ اقتصادیات بھی ایک علم ہے۔ انسان انفرادی اور اجتماعی حوالے سے اس کا حصہ بنتا ہے اور اس سے تعلق خوشحال زندگی کے لیے کوششوں کا نام ہے۔ معاشیات معاشرے میں دولت کا علم ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کا اہم پہلو بھی ہے۔ معاشیات کا تعلق دراصل معاشرتی زندگی سے ہے۔ آمدنی بڑھانے اور ملک کی بے روزگاری کم کرنے کے لیے معاشیات کس طرح استعمال میں لائی جاتی ہے یہ حکومت کے ذمہ ہوتا ہے۔

یونان کی بہت سی ریاستیں محض شہروں تک محدود تھیں۔ ایک شہر کو حکومت سرپرستی حاصل تھی۔ جہاں سے ساری سلطنت کی سیاسی اقتصادی اور سماجی امور کو دیکھا جاتا تھا۔ ریاستوں میں میں کچھ دیہی علاقے بھی شامل تھے جہاں کی زندگی شہری زندگی سے کاروباری حوالے سے مختلف تھی۔ وہاں لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے مگر اس سے زیادہ کاروبار مویشیوں کا ہوتا تھا۔ کچھ ریاستوں میں کسانوں اور ملاحوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ تجارتی حوالے سے لوگوں میں ایک خوشگوار تعلق پایا جاتا تھا:

> ”شہنشاہیت، ملوکیت، سامراجیت، استعماریت نوآبادیاتی نظام۔۔۔ حکومت کرنے کے لیے مختلف شکلیں شاید ہوں یانہ ہوں مگر منافع حاصل کرنے کی شکلیں بہرحال ہیں، عالمگیرت یا ہمہ ارضی۔۔۔ ترقی یافتہ شکلیں بہرحال ہیں۔ منافع چاہیے خواہ معاشرے تباہ ہو جائیں۔ منافع چاہیے چاہے تہذیبیں مٹ جائیں اور تمدن اجڑ جائیں۔“[۲۵]

حکومت کا کام سرپرستی، رہنمائی، امن وامان اور عدل وانصاف کرنا ہے۔ حکومت خود زمینداری کرے یہ قطعی غلط ہے۔ رعایا کو تربیت دینا انھیں معاشرے میں اچھا مقام دینا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ قوم کو قانون کے حوالے سے قواعد وضوابط کا پابند بنانے کا کام حکومت کا ہے۔ اگر صحیح معنوں میں سلطنت یا ریاست میں حکومت ہو تو لوگوں کے مسائل حل ہوتے ہیں اور اُن کی عزت، مال وجان کی حفاظت بھی اچھی طرح سے ہو سکتی ہے۔ ہر فرد کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنا ذاتی کاروبار کرے۔ اس پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالنا چاہیے کیونکہ اس

طرح وہ اپنے کاروبار کی طرف دھیان رکھے گا اور پوری محنت سے کام کرے گا اور کامیابی کی طرف گامزن ہونا شروع ہو گا جس کا فائدہ ریاست، حکومت کو بھی ہوتا ہے۔یونانی معاشرے آزاد شہری اور غلام کی زندگی کے حوالے سے علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:

"یونانی معاشرہ دو طبقات پر مشتمل، آزاد شہری اور غلام۔ بعض ریاستوں میں غلاموں کی تعداد آزاد شہریوں سے زیادہ تھی۔ جنگی قیدیوں سے کاشتکاری کا کام لیتے تھے۔ املاک پر چند بڑے بڑے خاندان متصرف تھے جن کے ہاتھوں میں حکومت کے نظم ونسق کی باگ دوڑ بھی تھی۔ یونان میں جزائر اے جین سے لے کر ساحلِ ایشیا اور اطالیہ تک سینکڑوں چھوٹے بڑے شہر آباد تھے ہر شہر ریاست کہلاتا تھا۔"[۲۶]

ایک منظم اور طریقے سے کیے گئے کام کا صلہ منافع کہلاتا ہے۔ تاجر ہو یا کسی بھی ملک کی حکومتی تنظیم محنت اور سرمایہ کے تعلق سے کسی بھی کاروبار کو شروع کیا جاتا ہے۔ ایک خاص وقت تک محنت جاری رہتی ہے۔ اپنی چیزوں کی فروخت کے لیے منڈی کا رخ کیا جاتا ہے۔ حاصل ہونے والی رقم اصل میں سرمایہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ جو محنت میں تیاری میں استعمال کی جاتی ہے مطلب آمدنی اور خرچے کا فرق منافع کہلاتا ہے۔ اگر حاصل ہونے والی رقم اصل سے کم ہے تو وہ خسارے کی طرف اشارہ ہے۔ دور قدیم میں منافع حاصل کرنے کے غلط راستے بھی چنے جاتے تھے جن سے معاشرہ تباہ بھی ہو جاتا تھا مگر اُس وقت کے بعض بادشاہ، حکومتی سربراہ اس بات کو پسِ پشت رکھ کر منافع کی طرف بڑھتے تھے۔ اس صورتِ حال کو ناول نگار وحید احمد نے زینو کو مختلف اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اب زینو مارکسی نظریے کے حوالے چن نامی شخص سے بات کرتا ہے تو چن اسے اس نظریے سے متعلق اپنا موقف پیش کرتا ہے:

"کمیونزم ضابطۂ حیات ہے۔ یہ وہ نظریہ ہے جو نجی ملکیت کی لعنت پر خطِ تنسیخ کھنچتا ہے۔ یہ مارکسی سوشلزم اور لینن ازم کی بنیاد انقلابی پرولتاری نظام ہے، جس میں تمام ذرائع پیداوار مزدوروں کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں۔ جنہیں ایک ہمہ گیر مطلق العنان پارٹی برابری کے اصولوں پر شہروں میں تقسیم کرتی ہے یوں کہ شہری کو اُس کی ضرورت کے مطابق مجموعی قومی پیداوار کا حصہ دیا جاتا ہے۔ کمیونزم مارکسی نظریے کا وہ آخری درجہ ہے جہاں

ریاست کا تصور ختم ہو جاتا ہے اور غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ جس میں تمام
وسائل اور پیداوار کے مالک اُس کو پیدا کرنے والے مزدور ہوتے ہیں۔"[۲۷]

مارکس کے انقلابی نظریے کی بنیادوں پر قائم کردہ نظام کمیونزم کہلاتا ہے۔ پرولتاریہ یعنی محنت کش لوگ غیر طبقاتی اور غیر استحصالی معاشرے کے لیے کی جانے والی کوششوں کا نام ہے۔ کمیونزم کے مطابق سرمایہ دارانہ نظام دراصل جمہوریت کی پاسدارہے جو آزادنہ منڈیوں کی معیشت اور انفرادیت پر مبنی ہے جو لبرل ازم کے فلسفے کو پیش کرتا ہے۔ لبرل ازم کا اس حوالے سے ایمان ہے کہ اس طرح کی حکمت علمی سے حالات اور مختلف ضروریات کی چیزیں بہتری کی طرف بڑھتے ہیں۔ سرمایہ داری میں اضافہ ہوتا ہے اور معاشرہ ترقی کی طرف بڑھتا ہے۔ مارکسی نظریے کے مطابق محنت کش لوگوں کی اقتصادی ذرائع پیداواری ذریعے لوگوں کی مشترکہ ملکیت میں ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس نظام میں کام کرتا ہے اور اُس کی ضرورتوں کو دیکھ کر اسے کام بھی دیا جاتا ہے۔ معاشرے میں ضروریات کی چیزوں کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے جن کے بغیر زندگی بے سود ہوتی ہے۔ لباس، غذا، صحت اور تعلیمی اخراجات سب کی ضروریات پوری ہونا ضروری ہوتی ہیں۔ مارکسی نظریے کے مطابق اس نظام میں بے کاری، بے روزگاری وغیرہ ختم ہو جاتی ہے۔ اس نظام کے منظم ہونے پر معاشرہ خوشحال اور آزاد ہو جاتا ہے۔ علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:

"مارکس نے کہا تھا کسی ملک کی سیاسیات، اخلاقیات وغیرہ اس کے معاشی نظام ہی سے متفرع ہوتی ہے۔ اضلاع متحدہ امریکہ کی سیاسی حکمت عملی اس کے معاشی تقاضوں ہی سے صورت پذیر ہوئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی سیاسیات کی باگ دوڑ بڑے بڑے اجارہ داروں یا ان کے نمائندوں کے ہاتھوں میں ہے جو دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں جنگ کی آگ بھڑکاتے رہتے ہیں تاکہ اپنا اسلحہ اور سامان حرب مہنگے داموں بیچ سکیں۔ ان کے گماشتے سفیروں اور اقتصادی مشیروں کی شکل میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی اقوام میں نفرت اور کشیدگی کی فضا پیدا کرتے ہیں۔"[۲۸]

کارل مارکس نے سماجی اقدار اور سرمایہ داری کے استحصال کے حوالے سے وضاحت کی اور ساتھ ہی جدلیاتی مادیت کا فلسفہ بھی پیش کیا۔ جدلیاتی مادیت کا فلسفہ مارکس کے نظریے کا بنیادی ستون ہے۔ مادی فلسفے میں چیزوں کی درجہ بہ درجہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ کارل مارکس نے ارتقاسے متعلق وضاحت کی کہ ایک روش پہ پہنچ

کر ارتقا کے آگے بڑھنے کے لیے بہت سی تبدیلیاں درکار ہوتی ہیں۔ طبقاتی کوششوں سے معاشرہ کا جمود ٹوٹنے لگتا ہے اس طرح ایک نیا نظام وجود میں آ جاتا ہے۔ زینو سے چند مارکسی نظریے کے حوالے سے بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے:

> "مارکسی نظریہ دراصل ہیگل کے جدلیاتی نظام کی اُلٹ مگر حقیقت پسندانہ اور عملی تصویر ہے۔ ہیگل کے مطابق ہر چیز مسلسل تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہے کیونکہ ہر چیز کے مخالف ایک دوسری چیز عمل پیرا ہے۔ اسی تصادم سے ایک تیسری اور نئی چیز عمل میں آتی ہے اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ مارکس کی مادی جدلیات کے مطابق تبدیلی ہر چیز کی جبلت میں ہوتی ہے۔ تبدیلی کے لیے جدلیاتی اصولوں کی ضرورت نہیں بلکہ عملی دانش اور آگہی کی ضرورت ہے جن سے جدلیاتی حقائق خود بخود سامنے آتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ سرمایہ داری نظام ایک استحصالی دیمک ہے جو معیشت کو چاٹ کر کھوکھلا کر رہی ہے۔ سرمایہ داری نظام بورژوائی طبقے کی پرورش کرتا ہے اور پرولتاریوں کی رگوں سے خون اور پسینہ نچوڑ کر قدرِ زائد پیدا کرتا ہے۔ یہ قدرِ زائد مزدوروں کی صرف شدہ قوت کی وہ مالیت ہے جو اُن کی اجرتوں سے زائد ہوتی ہے اور جسے مل مالک اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ قدرِ زائد کے بل ہوتے پر بورژوائی طبقے کی عیاشی اور مزدوروں کا استحصال ہی وہ عوامل تھے جنہوں نے کال مارکس سے کمیونزم کے سنہری اصول لکھوائے۔"[۲۹]

سائنس کی تاریخ میں جدلیات کو ایک جامع فلسفیانہ نظام متعارف جارج ہیگل نے کرایا۔ اس نے جدلیات کے حوالے سے اپنے تین اصولوں کو دنیا کے سامنے رکھا۔ انہی اصولوں پر کارل مارکس نے اپنے دوست فریڈرک اینگلز کے ساتھ مل کر بعد ازاں بات کی تھی۔ ہیگل نے بھی زینو کے جدلیاتی فلسفے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کام کیا ہے۔ ارسطو نے جدلیات کا بانی زینو کو کہا ہے۔ زینو کے ساکن تیر کی مثال دے کر اُس نے تضادات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو مکاں اور زماں سے متعلق ہمارے ذہنوں میں موجود ہے اور اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حرکت غیر حقیقی ہے یعنی حرکت ناممکن ہے۔ یوں ارسطو نے نئے سرے سے زینو کے جدلیاتی فلسفے کو منطقی صورت میں بنیادی حیثیت دی تھی۔ ہیگل ابتدا میں تصوف کی طرف دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک کائناتی حقیقت ذہن کا ارتقا ہے۔ کائنات میں جو بھی ہو رہا ہے وہ دراصل جدلیاتی عمل سے ہو رہا ہے۔ مادی دنیا کی تخلیق ذہن نے کی ہے۔ اس مادی اور ذہنی کائنات میں ایک ہی طرح کے جدلیاتی اصول رکھے ہیں۔ ذہن تمام دنیا میں تخلیق کے عمل سے گزر

رہا ہے۔مارکس نے معاشی زندگی کی بہتری کے لیے سرمایہ دارانہ نظام کو سیکھنے سمجھنے میں زندگی صرف کی۔ فلاح وبہود کے لیے غوروفکر سے مارکسی نظریے کو جنم دیا۔لینن نے مارکس کی فکر پر عملی طور پر ایک نظام تک مرتب کر کے ایک ریاستی نظام کو تشکیل دی۔ کارل مارکس نے کہا کہ کوئی بھی سماجی نظام اُس وقت تک تباہ وبرباد ہوتا نہیں جب تک پیداواری تمام قوتیں امکانی طور پر ترقی نہ پاچکی ہوں یہ نظام جس کے لیے بہتر ثابت ہو سکتا ہے۔ اور نئے پیداواری رشتے ناتے بھی اُس وقت تک پرانے راستوں کی جگہ نہیں لیتے جب تک پرانے سماجی دائرے حدود میں اُ ن کے لیے معاشی حالات مضبوط نہ ہوں۔ بورژوا سماج میں جو قوتیں ترقی پاتی ہیں۔ وہ مادی حالات بھی پیدا کر لیتی ہیں۔

ناول نگار نے بھی اس ناول میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کس طرح سرمایہ دار نظام بورژوائی طبقے کو پروان چڑھاتا ہے۔ کس طرح یہ سرمایہ دار نظام مزدور طبقے کی محنت کو دیمک کی طرح کھاجاتا ہے۔ حکمران طبقہ اپنے فائدے کے لیے مزدور طبقے کا استحصال کر کے دولت کماتا ہے اور پھر کسی بھی معاشی ہنگامی حالت کو قابو میں لانے کے لیے حاتم طائی کا روپ بھی دھار لیتا ہے۔ وحید احمد کے مرکزی کردار زینو جو ہر دور میں مرکزی کردار بن کر سامنے آتا ہے۔ زینو کارل مارکس کی لکھی ہوئی کتاب پڑھتا ہے۔ جس میں مضمون کچھ اس طرح ہوتا ہے:

> ”وہ معاشرے جہاں سرمایہ داری نظام پیداوار رائج ہے۔ اجناس کی بے پناہ بہتات کا شکار ہوتے ہیں چنانچہ ہماری تحقیق کا آغاز اجناس کے تجزیے سے ہو گا۔ جنس وہ چیز ہے جو ہمارے وجود سے باہر اپنا وجود رکھتی ہے اور اپنی خصوصیات کی بنا پر انسانی خواہشات کو مطمئن کرتی ہے۔ یہ خواہشات انسانی جسم کی ضرورت بھی ہو سکتی ہے اور سراب خیال بھی مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ خواہشات کی قسم کون سی ہے اور نہ ہی اس مقام پر ہم یہ بحث کرنا چاہتے ہیں کہ اجناس کس طرح انسانی خواہشات کی تکمیل کرتی ہیں۔“[۳۰]

ناول نگار مارکسی نظریے کے حوالے سے لکھتا ہے کہ جس معاشرے میں بھی سرمایہ دارانہ نظام مسلط ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں ضروریات کی چیزوں میں کمی واقع ہوتی ہے اور بہت زیادہ کمی دیکھنے میں آتی ہے۔یعنی وہ چیز جو ہمارے جسم سے باہر موجود ہے ہماری ضرورت ہو سکتی ہے اور کون کون سی چیز ہے جو ہماری ضرورت کی ہے اور ہمیں فائدہ دے سکتی ہے۔ لیکن جہاں اجناس خوراک غذا اور زندگی میں دوسرے معاملات میں کام آنے والی

اشیا موجود ہیں ان کی کمی کی وجہ سے یقیناً کوئی بھی معاشرہ تنزلی کی طرف بڑھتا ہے۔ کلاسیکی بورژوا اور کارل مارکس نے بھی اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی کہ یہ قدر کیا ہے؟ بہت کوششوں سے وہ اس نتیجے پہ پہنچے کہ قدر دراصل محنت کا ماخذ ہے۔ قدر کی تھیوری بورژوا سیاسی حوالے سے معاشیات کی بنیاد بنی تھی۔ اس کا آغاز ایڈم سمتھ نے کیا تھا۔ بورژوا کا تصور قدر کے حوالے سے ایک بند گلی کی طرح تھا۔ مارکس وہ شخص تھا جس نے اس بند گلی کو کھولا اور ایک نیا راستہ ڈھونڈ نکالا۔ مارکس نے قدر کی تھیوری کو آگے بڑھایا اور اس کی تفصیلی شکل دی۔ سرمایہ داروں کے بنائے ہوئے قوانینِ حرکت اور قدر کے اضافے کو دریافت کرنے کا ایک راستہ تھا۔ تمام قدر انسانی محنت کے بل بوتے ہے۔ امیر طبقہ دولت محنت کش لوگوں کی ہاتھ کی محنت سے حاصل کرتے ہیں۔ انھوں نے خود کچھ نہیں کیا ہوتا بلکہ مزدوروں محنت کشوں کو استعمال کر کے کمایا ہوتا ہے جن پر وہ سانپ بن کے بیٹھے ہوتے ہیں۔ قدر کا نظریہ بہت سادہ ہے اور آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ انسان صرف محنت کر کے ہی زندہ رہ سکتے ہیں اپنی زندگی گزار سکتے ہیں اور اپنی ضروریات کی چیزوں کو حاصل کر سکتے ہیں۔ مارکس کی زندگی کا ایک مقصد تھا کہ پرولتاریہ کی جدوجہد بنی نوع انسان کی مکمل آزادی کے لیے معاشرے کو ایک بہترین شعور دینا۔ مارکس نے پرولتاریہ کے حوالے سے انقلابی نظریہ فراہم کیے اور اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:

> ''کارل مارکس کی عظمت پر اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ ان نامساعد حالات میں بھی اس نے اپنا فکری و عملی کام پورے عزم و حوصلے کے ساتھ جاری رکھا۔''[۳۱]

ناول میں زینو کا مرکزی کردار ہے جو اپنے دوستوں کے ساتھ ملکی اقتصادی نظام کے حوالے سے بات کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے کارل مارکس کے فلسفے سے کوئی اختلاف نہیں مگر اس کے اطلاق سے اختلاف ضرور ہے۔ زینو نے افلاطون، ارسطو، ایڈم سمتھ اور کارل مارکس کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور کہا دانشور اپنے جگر کے خون سے فلسفے کے لفظ پروتا ہے۔ ناول نگار مرکزی کردار زینو اقتصادیات میں مارکس کے نظریے کو اس طرح دیکھتا ہے۔

> ''جس طرح ماضی میں کمیونزم کی توہین کی گئی اس طرح آج کل سرمایہ کاری کے بخیے اُدھیڑے جا رہے ہیں۔ پرولتاری انقلاب اور غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ پیداوار کی بے پناہ بہتات ہو اور کمیونسٹ پارٹی کی سربراہی فرشتوں کے ہاتھ میں ہو۔ سرمایہ کاری نظام چلانے کے لیے ضروری ہے کہ منافع حاصل کرنے کے

جنون میں زمین کو اندھادُھند خرچ کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ دونوں نظام اچھے ہیں مگر دونوں کو چلانے کے لیے ظرف چاہیے۔"[۳۲]

مارکس کے ساتھ اسٹالین، ماؤ اور لینن نے اس کمیونزم کی تخلیق کی۔ مگر جس کمیونزم کی بات اپنے دور میں مارکس کرتا رہا وہ دراصل کمیونزم نہیں تھا جس نے جمہوریت کی بات کی تھی اس نے آمریت کو جنم دیا تھا۔ اخلاقیات اور غیر انسانوں کے رویوں میں شدت کو دیکھا گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کمیونزم کے خلاف بات کرنے والے بھی لوگ موجود تھے۔ مگر کمیونزم کے حامی اس کو توہین سمجھتے رہے۔

کمیونزم کہتا ہے کہ مارکسی نظریے کے مطابق تمام امیروں کو تباہ و برباد کر کے دولت کو تمام لوگوں میں تقسیم کر دی جائے۔ یعنی مارکس غریبوں کے حق کی بات کرتا ہے۔ اس انقلاب کے لیے یہ ضروری ہے کہ بے شمار پیداوار ہو اور اس کی دیکھ بھال صرف کمیونسٹ پارٹی کرے ان کے سربراہ کریں وہ خود غریبوں میں ایمانداری سے تقسیم کریں گے کیونکہ اُن سے ایمان دار غریبوں کے لیے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اب کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ واقعی اچھا اور مخلص ہے جو غریبوں کو اس کا حق دلائے گا۔ کمیونزم مگر اس بات پہ بضد ہے کہ وہ ٹھیک ہے۔ وہ معاشرے کی بہتری کے لیے بات کرتا ہے۔ اسے اس نظام کو بہتر بنانے کے لیے سرمایہ کاری کا نظام اس طرح چلانا ہو گا جس سے منافع زیادہ سے زیادہ ہو اور فضول خرچی سے ہاتھ کھینچ کر ایسا نظام مرتب کیا جا سکتا ہے جس میں مزدور طبقے کی توہین نہیں ہو گی۔ کارل مارکس کے نظریے سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں صرف کارکن زندہ رہنے کے قابل ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو ہتھیار استعمال کرنا جانتے ہیں یا پھر ایسے کاری گر جو سورج اور زمین کے تعلق کو سمجھتے ہیں کارل مارکس کا یہ اشارہ کسانوں کی طرف تھا۔ کیونکہ انھیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ کون سے موسم میں کس جگہ کون سے بیج سے کون سی فصل حاصل کی جا سکتی ہے۔ مارکسی نظریے کے مطابق صرف ہنر مند اور کاری گر لوگ زندہ رہنے کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ تقریباً ایک سو برس سے آزاد معیشت اور اشتراکیت کے نظام آپس میں الجھاؤ کا شکار ہیں۔ ان خیالات کے حامی لوگ دنیا کے سیاسی نظام پر مسلط ہیں۔ اشتراکیت کا نظام تو ستر برس کے اندر ہی اختتام پذیر ہو گیا تھا اور سرمایہ دارانہ نظام دور قدیم سے آج بھی غرور سے اپنی گردن اونچی کیے ہوئے غریبوں کی زمین پہ اکڑ کے چل رہا ہے۔ ایسے لوگ دنیا کی سیاسیات اور اقتصادیات کے خود کو مالک سمجھتے ہیں۔

v۔ علوم وفنون:

علوم و فنون میں سب سے پہلے فطرت کا ذکر کرنا ضروری ہے۔کائنات میں ایک سے ایک بڑھ کے خوبصورت چیز اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے۔زمین اپنے اندر بے شمار خزانے کی صورت میں معدنیات رکھتی ہے اور اپنی کوکھ سے بہت حسن اس دنیا میں بکھیرا ہے۔موسم بہار جوبن کے ساتھ آتا ہے۔خوب صورت مختلف اقسام کے پھول اپنی خوشبو پھیلاتے ہیں۔پہاڑوں سے صاف شفاف پانی اترتا ہے۔پہاڑ، درخت، پانی کے چشمے، سرسبز کھیت، جنگل، صحرا بے شمار حسن فطرت نے اس کائنات میں تخلیق کیا ہے۔ناول نگار نے بھی اپنے ناول میں یونان کے حوالے سے فطرت کے باکمال نقشے کو کھینچا ہے:

> "جب یہ تینوں جزیرے پر اترے تو زینو کا باپ وہاں کی زرخیزی اور قدرتی دولت دیکھ کر دَنگ رہ گیا۔انواع واقسام کے درخت تھے یونان میں شاہ بلوط، زیتون، جونیپر، صنوبر اور پاپلر کے درخت نظر آتے تھے مگر یہاں ان درختوں کے علاوہ ناریل کے درختوں کا جنگل تھااور کچھ ایسے درخت بھی تھے جوان لوگوں نے پہلے نہیں دیکھے تھے؛ پرندوں کی بہت سی قسمیں تھیں۔پھل دار درختوں کی بہتات تھی جزیرہ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اس میں صاف پانی کی ایک بہت بڑی جھیل تھی۔میدان اور ٹیلے تھے۔بعض ٹیلے چھوٹی پہاڑیوں کے برابر تھے۔"[۳۳]

علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:

> "یونان میں بحیرۂ روم کے خطے کی آب وہوا ہے یعنی گرما میں خشک اور سرما میں بارش۔سال بھر میں بیس انچ کے قریب بارش ہو جاتی ہے۔مغربی حصے میں ایک طویل سلسلۂ کوہ ہے جو کوہ ایپس کی شاخ ہے۔سب سے اونچا اولمپس کا ہے جس کی چوٹی کو یونانی اپنے دیوتاؤں کا مسکن سمجھتے تھے۔اس کی بلندی نوہزار سات سو چون فٹ ہے۔پہاڑوں کے درمیان اور ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ زرخیز میدان ہیں جہاں گندم، انگور، نارنگی اور زیتون اُگائے جاتے ہیں۔شدید جاڑے میں بھی کہُرا نہیں پڑتا اس لئے گرم آب وہوا کی بعض فصلیں بھی کاشت کی جاتی ہیں۔"[۳۴]

زراعت کی پیداوار کے اعتبار سے یونان کسی دور میں خود کفیل رہا ہے۔ اس جغرافیائی ماحول میں یونان کی تہذیب و تمدن نے جنم لیا تھا۔ کائنات میں مخلوقات میں سب سے زیادہ درجہ انسان کا ہے اسی لیے انسان کو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔ انسان نے دُنیا میں رہ کے اپنے اپنے حصے کے کام کیے ہیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ دُنیا کو سنوارنا اسے خوب صورتی دینا بھی انسانی کی ذہانت اور محنت کے ذریعے یہ ممکن ہوئی ہے۔ جسے فنون کا نام دیا گیا ہے۔ انسانی میل جول کی وجہ سے معاشرہ وجود میں آیا ہے جس میں تہذیبیں بنی ہیں۔

فن کار نے بے مثال نمونے عمارتوں کی صورت میں، مجسموں کی صورت میں اور نقش و نگار دیواروں پر، برتنوں پر قدیم دور سے آج تک چلا آرہا ہے۔ قدیم دور کی فنی تخلیقی مہارت بھی نسل در نسل مختلف تہذیبوں کی عکاس ہے۔ مجسمہ سازی اور ظروف سازی قدیم فن ہیں۔ جو مختلف تہذیبوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ مجسمہ سازی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یونانیوں کو مجسمہ سازی سے عشق تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اُن کا یہ فن یونان کی ترقی کے لیے بھی ایک اہم ذریعہ ہے۔ مختلف فن پاروں کی تخلیق میں یونانی مہارت رکھتے تھے۔ معاشرے میں مختلف مسائل کے ابلاغ کے لیے مجسمہ سازی کا بھی سہارا لیا جاتا رہا۔ یونیوں کے ہاں اعلیٰ قسم کی مصوری، مجسمہ سازی اور عمارت کاری قابلِ تعریف ہیں۔ یونانی آرٹ دراصل ایک تصوراتی، مثالی اور نظریاتی عمل رہا۔ یونانی مجسمہ ساز عورت کے جسم کو ہی نہیں بلکہ مرد کے جسم کو بھی ایک حسین شکل دینے میں ماہر تھے۔ وحید احمد زینو کے والد جو کہ مجسمہ ساز ہوتا ہے اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”زینو کا باپ مجسمہ سازی اور ظروف کی نقش نگاری میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔ وہ ایتھنز کے ایک مصری مجسمہ ساز کے ساتھ کام کرتا تھا جو کوزہ گری اور ظروف سازی کے باعث بہت مشہور تھا۔ مصری مجسمہ ساز کے پاس پانچ سو سال پرانے نوادرات تھے۔ جب پہلے پہل مصری اور یونانی ظروف سازی کا سنگم ہوا تو ان نوادرات میں مصریوں کے بنائے ہوئے نقشین ظروف تھے۔ جن پر ابوالہول اور گریفن بنے ہوئے تھے۔ ان کے مدِ مقابل یونانیوں کے بنائے ہوئے قنطروس، دستور اور مائینوٹار کے نقوش سے مزین بیش قیمت نوادرات تھے۔ زینو کی ماں اسی مصری مجسمہ ساز کی بیٹی تھی۔“[۳۵]

یونانی زینو کا باپ مجسمہ سازی کے حوالے سے بہت مشہور تھا۔ کوزہ گری اور برتنوں پر نقش و نگار بنانا یونانیوں کے فن میں شامل تھا۔ مجسمہ سازی یونانی تہذیب و تمدن کا شہکار ہے۔ اس ناول میں مجسمہ سازی، ظروف

سازی اور نقش و نگار کے حوالے سے جس طرح ناول کے کرداروں نے فن کا اظہار کیا اس سے پتا چلتا ہے کہ یونانی عوام نے علوم و فنون میں کس طرح بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ برتنوں پر جانوروں اور پرندوں کی تصاویر بنانا یونانی کلچر کا وہ خوبصورت اظہار تھا۔ اس لیے یونانی دور مجسمہ سازی کے حوالے سے مشہور ہے۔ علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:

> "جن فنون نے یونان کے آرٹ کو ضرب المثل بنادیا وہ اُن کی تمثیل نگاری اور سنگ تراشی ہیں۔ یونانیوں کے مجسمے تناسبِ اعضاء اور حسن و جمال کے مثالی نمونے سمجھے جاتے تھے۔ یونانی ورزش اور کھیل کود کے شیدائی تھے اور جسم کے خطوط کی رعنائی کو برقرار رکھنے میں بڑا اہتمام کرتے تھے۔"[۳۶]

قدیم زمانے میں رومی اور یونانی تہذیب نے بہت بڑی سلطنت قائم کی تھی۔ یونان میں سیاسی نظام مضبوط تھا اس لیے یونانی قوم کے اندر بہت حوصلہ پیدا ہوا اور یونان خوشحالی کی طرف بڑھنے لگا۔ یونانی کھیل علم آرٹ کے میدانوں میں بہت آگے تھے۔ انسان نے فنِ تعمیر، مجسمہ سازی اور مصوری، نقش و نگار کے اظہار کے لیے تخلیقی خیال پیدا کیا۔ فنی تخلیقات کی چاہ سب سے زیادہ انسان میں پیدا ہوتی ۔فنی صلاحیت کے پیچھے محبت ، حسن، خوشی، غمی اور عبادت اس کا جذبہ تھا جس نے انسان کی فنی تخلیقات کو اجاگر کیا۔ جب دل میں ان جذبات سے انسان خالی رہتا ہے تو فنی مہارت سے دور رہتا ہے اس کے اندر اس طرح کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا۔ یہی جذبات انسان کے اندر ایسی کیفیات پیدا کر دیتے ہیں جن کے محرکات میں تخلیقی عمل پیدا ہوتا ہے۔ محبت، غم، خوشی نے خاکہ نقش و نگار کا جذبہ پیدا کیا۔ فن اپنے اظہار کا سب سے بڑا راستہ ہے۔ قدیم دور میں جب انسان غاروں میں رہائش پذیر تھے۔ وہ جنگلی جانوروں کا شکار کرتے تھے اور اپنی غذا کا بندوبست کرتے تھے۔ یونان میں زینو فلاسفر کا باپ بھی اپنے علاقے کا لائق انسان تھا۔ افلاطون فلاسفر کے ہاں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ ناول نگار نے تعلیمی صلاحیت کے حوالے سے اس ناول میں بتایا ہے کہ کس طرح یونانی علوم و فنون کی طرف زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ ناول نگار وحید احمد زینو کے باپ کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

> "زینو کے باپ کا تعلق مقدونیہ کے ایک دور افتادہ قصبے سے تھا۔ وہ انتہائی ذہین شخص تھا اُس کے نین نقش واجبی تھے۔ فلسفے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ افلاطون کی اکیڈمی میں بیس سال تک تعلیم حاصل کی اور افلاطون کے خاص شاگردوں کی صف میں آکھڑا ہوا۔ وہ ارسطو کا ہم عصر دوست اور مدِ مقابل تھا۔ عمر میں ارسطو سے چند سال بڑا تھا۔ اکیڈمی میں اکثر ارسطو

سے مباحثہ رہتا اگرچہ وہ فلسفہ ،طب،حیاتیات،اخلاقیات،فنِ شعر گوئی کا عالم تھا مگر حیاتیات اس کا خاص میدان تھا۔"[۳۷]

ایتھنز میں افلاطون کی اکیڈمی میں بہت نامی گرامی فلاسفرز نے تعلیم حاصل کی۔کئی موضوعات جن میں علمیات،سیاست،مابعد الطبیعیات اور اخلاقیات کا درس دیا جاتا تھا۔افلاطون نے بہت سے موضوعات پر لکھا۔افلاطون کے مکالمات کا مرکز سقراط ہے۔مگر آج تک اس بات کا تعین نہیں ہو سکا کہ کون سی تحریر سقراط کی ہے اور کون سی تحریر افلاطون کی ہے۔افلاطون کی مشہور کتاب 'جمہوریہ' کے نام سے ہے جس میں اہم سیاسی نظام کو متعارف کرایا گیاہے۔زینو اپنے باپ کے ساتھ اس طرح بحث کرتا ہے:

"میں شکوہِ الفاظ سے متاثر نہیں ہوتا کیونکہ میں علم بیان اور خطابت کو کمینگی کی آخری حد سمجھتا ہوں۔مجھے افلاطون کا مکالمہ گارگیاس زبانی یاد ہے جو تم نے مجھے پڑھایا تھااور تمہیں یاد نہیں اُس مکالمے میں جو سقراط کا نقطۂ نظر ہے،مجھے اس سے اتفاق ہے مگر چونکہ تم لفظوں کے پتھر چن کر سٹیڈیم بناتے اور اس میں لہجے کا تماشا کرتے ہو،اس لیے تمہیں تمہارے لہجے میں سمجھانا پڑے گا۔زینو نے نیلی جھیل کے خنک پانی کی طرح ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔"[۳۸]

زینو اپنے باپ کے نظریے سے اختلاف کرتا تھا۔زینو کو علم بیان اور خطابت سے چڑ تھی۔وہ کہتا تھا کہ بات وہ کی جائے جس میں دم ہو جس کا کوئی فائدہ نظر آرہا ہو۔یونہی لفظوں کے پتھر مارنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔جس لہجے میں کوئی مٹھاس نہ ہو اس لہجے نے نفرتیں ہی پیدا کرنی ہیں۔زینو نے اپنے باپ سے سخت لہجے میں بات کرتے ہوئے کہا کہ میں اس لہجے میں اس لیے بات کر رہا ہوں کیونکہ اس طرح تمہارا لہجہ ہے۔زینو نے یہ بات ایسے کہی جیسے کسی جھیل میں ٹھہرا ہوا پانی ہو۔

یونان کے مشہور شہر ایتھنز میں افلاطون کی ایک درسگاہ تھی۔افلاطون کے بعد اس کا بھتیجا سپوسیپس سربراہ تھا۔وہاں بہت سے طلبہ نے فلسفہ کے حوالے سے زینو اور دوسرے فلاسفرز سے پڑھا۔اس اکیڈمی میں یونان کے فلاسفرز اکٹھے ہوتے تھے اور منطق پر بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔یہ وہی اکیڈمی ہے جہاں افلاطون لیکچر دیا کرتا تھااور اسی اکیڈمی میں ارسطو جیسا ہونہار طالب علم شاگرد افلاطون کو ملا تھا۔ناول نگار نے زینو کے بارے لکھا کہ وہ افلاطون کی اکیڈمی میں منطق پر بحث کرتا تھا:

"ایتھنز میں زینو نے افلاطون کی اکیڈمی دیکھی، جہاں اب افلاطون کا بھتیجا سپوسیپس منتظم اعلیٰ تھا۔ وہاں اکیڈمی کے طلبہ کے ساتھ زینو نے منطق پر بحث کی۔ زینو کا باپ اپنے بیٹے کے بے پناہ حافظے اور منطق کی کاٹ پر فخر کرتا تھا جو اب رشک میں بدلتا جارہا تھا۔ اُن کا معمول تھا کہ جزیروں میں پہروں چلتے ہوئے علم کا اعادہ کیا جائے۔ زینو کو اس وقت اُکتاہٹ ہوتی جب اس کا باپ اچانک موضوع تبدیل کر کے اپنی گفتگو سونے کی تلاش پر مرکوز کر دیتا۔"[۳۹]

زینو ذہین تھا اور اس کی گواہی اس کا باپ بھی دیتا تھا اور اسے فخر تھا کہ اس کا بیٹا بے پناہ حافظے کا مالک ہے اور منطقی حوالے سے اس سے کوئی بحث نہیں کر سکتا۔ زینو افلاطون کی اکیڈمی افلاطون کے شاگردوں سے مختلف سوالات کرتا۔ زینو کا باپ اسے بہت کچھ سکھا چکا تھا اور علت و معلول کے حوالے سے زینو کو تقریباً چار دن تک اسے پڑھاتا رہا۔ حیاتیاتی اور مادے کی ارتقا کے حوالے سے حرارت کے اثرات کے بارے میں زینو نے سیکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کے حوالے سے زینو کے باپ نے اسے بتایا۔ اس لیے زینو کے باپ کو اس حوالے سے کوئی پریشانی نہیں تھی کہ زینو کس طرح لوگوں کے ساتھ رہ سکے گا۔ ارسطو نے سکندر کو سکندر اعظم بنانے کا عمل بے ساختہ انداز سے کیا۔ ارسطو نے اس حوالے سے کہا:

"حقیقت پڑھتے پڑھتے جب انسان کی جمالیاتی حِس شل ہو جاتی ہے تو افسانوی دُھند لکے اس تھکاوٹ کو دور کرتے ہیں۔ شاعری پیدا کرنے کو عمل ہے۔ سائنسدان اور شاعر دونوں لفظوں کی وساطت سے بیان کو عمل میں لاتے ہیں۔ مگر شاعر سائنسدان سے مختلف اس طرح ہوتا ہے کہ وہ پیدا کرتا ہے جبکہ سائنسدان آشکار کرتا ہے۔ یونان چونکہ زرخیز ذہنوں کی سرزمین ہے، چنانچہ ہماری شاعری جب کسی موضوع کا انتخاب کرتی ہے تو اس کی جُزئیات نگاری کو اجرامِ فلکی کی کاملیت کے برابر کھڑا کرتی ہے۔"[۴۰]

جمالیات کا تعلق حِس سے ہے بلکہ حِسِ لطیف سے ہے۔ اردو میں اسے حسیات اور وجدانیات بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی انسان کا تعلق قوتِ حِس اور اس کے محسوسات سے ہے۔ جمالیات کا موضوع فنونِ لطیفہ اور حسن ہے۔ اگر جمالیاتی حس میں خوب صورتی نہیں رہتی تو اس میں حرارت لانے کے لیے کوئی تخلیقی عمل ضروری ہو جاتا ہے۔ یونانی فن کاروں کا جمالیاتی شعور متحرک اور بیدار رہا ہے۔ اُن کی تہذیب کے رگ رگ میں علوم و فنون کے عناصر بیدار رہے ہیں۔ اسی لیے ناول نگار نے بھی زینو کے حوالے سے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ

انسانی جمالیات کے متحرک رہنے سے انسان کی طبیعت میں نکھار آتا ہے۔ یونان میں فلسفۂ جمالیات میں ادبیات کا ذکر خاص طور پر کیا جاتا تھا۔ شاعری جیسے سرمایے سے جزوی طور پر استفادہ کیا جاتا تھا۔ یونانی تہذیب میں شعر و ادب، موسیقی، مصوری، مجسمہ سازی کے علاوہ دیگر فنون لطیفہ کو اس قدر اہمیت حاصل نہیں تھی۔ ناول میں زینو کردار بھی اس بارے میں کہتا ہے کہ ہماری شاعری جب بھی کسی موضوع یا کسی بات کو چنتی ہے تو اُس اپنا حق ضرور ادا کرتی ہے۔ شاعری چھوٹی سی چھوٹی بات غم کو بھی تفصیل سے بیان کرتی ہے۔

ٹیکسلا ضلع راولپنڈی کی تحصیل ہے۔ یونانیوں اور رومیوں نے اس شہر کو ٹیکسلا کا نام دیا تھا۔ یہ شہر علوم وفنون کے حوالے سے بہت مشہور تھا۔ یہاں موریا خاندان کے راجا امبھی کا راج تھا۔ جس نے سکندر اعظم کے نام پہ ٹیکسلا میں کئی عمارتیں بنوائی تھیں۔ یہاں کی تہذیب و تمدن عروج پہ تھی۔ اس شہر کے مختلف علاقوں سے دورِ قدیم کی باقیات کھدائی کے دوران خانقاہیں اور اسٹوپے دریافت ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ دور کوشان کے سکے نکلے تھے۔ شیوا اور بدھا کی تصاویر بھی ملیں۔ تحسین کردار نے جسے مجسمہ سازی کا بہت شوق ہے۔ ناول نگار نے اس کے مجسمہ سازی کے حوالے لکھا ہے:

> "تحسین قدیم مجسّموں کے نقشِ ثانی بنانے کے لیے مشہور تھا۔ اُس نے ٹیکسلا کے کھدائی سے نکلے ہوئے کئی مشہور مجسّموں کے "ریپلیکا" بنائے تھے۔ اُس کے بنائے ہوئے ریپلیکا پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔ وہ گزشتہ کئی سال سے فاسٹنگ بدھا کا نقشِ ثانی بنانے میں مصروف تھا جو اُس نے گزشتہ دِنوں مکمل کیا تھا۔ اس بار بر ٹل وہی نقشِ ثانی دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ حویلی کا ایک ہال تحسین نے سٹوڈیو میں تبدیل کیا تھا۔"[۴۱]

اس ناول کے کردار یونانی فن کاروں کی طرح سرگرم رہتے ہیں۔ جیسے تحسین کردار جو ٹیکسلا میں کھدائی کے دوران دریافت ہونے والے قدیم دور کے مجسّموں کو دیکھ کر اسی طرح کے بنانے کا ماہر تھا۔ یعنی اصل گوتم بدھا کا مجسمہ بھی اُس نے نقل بنایا جس پر اصل کا گمان ہوتا رہا۔ اور اس کے فن کو دیکھنے کے لیے لوگ آتے رہے۔ اکیسویں صدی عیسوی میں برطانیہ کے مشہور ماہر طبعیات نے بھی اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ آنے والے دور میں انسان اپنا بھی ریپلیکا بنا سکتا ہے۔ یونان کی سرزمین بے شک ذہانت کے حوالے سے بڑی زرخیز رہی ہے۔ لیکن دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلا اور بڑا ماہر لسانیات پانینی تھا۔ جس نے سنسکرت کی گرائمر لکھی۔ اس میں سنسکرت صرفیات کے قواعد درج ہیں۔ انسانی تاریخ میں پانینی پہلا ماہر لسانیات سمجھا جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں

پہلی بار اس کی تحریروں کا ترجمہ بھی کیا گیا۔ سنسکرت زبان کو ہندو مذہب میں الہامی زبان سمجھا جاتا ہے۔ اس زبان کو پاننی کی وجہ سے لسانیاتی نظریات میں اہمیت ملی۔ اس نے لفظوں کی ساخت، لسانی صوتیات سے متعلق جامع اور سائنسی نظریے پیش کیے۔ اس کی کتاب کا نام استھدپائی ہے جس کا مطلب آٹھ ابواب ہیں۔ اس ناول کا ایک اور اہم کردار جو گندھارا تہذیب کا ہیرو سمجھا جاتا تھا۔ وہ کہتا ہے:

"ٹیکسلا کی مٹی بڑی زرخیز ہے۔ پاننی یہاں کی درسگاہ کا طالب علم تھا۔ جس نے سنسکرت زبان کی صرف ونحو لکھی۔ پاننی کو یونانی زبان کا علم تھا۔"[۴۲]

سنسکرت کے صرف ونحو کا مصنف پاننی نے ٹیکسلا یونیورسٹی سے اپنی تعلیم حاصل کی۔ پاننی کو بابائے لسانیات کہا جاتا ہے۔ سنسکرت کے علاوہ اسے یونانی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ لیکن اس نے زبان کے قواعد کے حوالے سے سنسکرت زبان کو اہمیت دی۔ اس نے علم الاصوات، علم الاشکال کے حوالے سے لکھا اور گرائمر کو سائنسی نظریے کے مطابق تیار کیا۔ پاننی کے تعارف میں ولی اللہ خاں لکھتے ہیں:

"مشہور سنسکرت عالم اور قواعد پاننی (PANINI)| جو صوبہ سرحد کے ایک مقام سلاتورا(SALATURA) میں رہتا تھا۔ سلاتورا اب لاؤر (LAOR) کہلاتا ہے اور جہانگیرا ریلوے سٹیشن سے تقریباً ۸ میل اندر یعنی شمال کی طرف ہے اور اب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے کہاں بہت بدھ آثار ہیں۔ پاننی ۳۰۰ ق۔م سے قبل اور بعض مؤرخین کے خیال میں چوتھی بلکہ پانچویں صدی ق۔م میں حیات تھا۔"[۴۳]

قدیم یونان میں والدین بچوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے تھے۔ انھیں معاشرے میں ایک کامیاب فرد بنانے کے لیے فلسفے، مصوری، تیر اندازی، گھڑ سواری، خطابت، شاعری، مجسمہ سازی کی طرف راغب کرتے تھے۔ لیکن یونانی سماج میں سب سے زیادہ فلسفی کو اہمیت حاصل تھی۔ افلاطون، ارسطو، زینو اور سقراط جیسے قابل فلاسفرز نے یونان کو پوری دُنیا میں فلسفی حوالے سے متعارف کرایا۔ ناول نگار نے زینو کی ذہانت و بصیرت کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا ہے:

"بہت خوب۔۔۔ بیٹا بہت خوب تم فنِ خطابت جان گئے ہو۔ یعنی لفظوں کا صحیح چناؤ لہجے کے آہنگ کا زیر و بم اور دلیل کی کاٹ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر باپ بھی مدِ مقابل ہو تو

مقابلہ دشمن بن کر کیا جائے۔ داخلی سوچ کو اس طرح لوچ دی جائے کہ اس پر خارجی ہونے کا گمان ہوا اور عین صحیح ہونے کا شائبہ۔" باپ نے اپنے لہجے کو مسلسل سرد کرتے ہوئے کہا اور زینو کے ماتھے کو چوما۔ زینو نے باپ کے ہونٹوں سے عیاری اپنے ماتھے میں سرایت کرتی ہوئی محسوس کی۔"[۴۴]

یونان کی تہذیب میں علوم وفنون بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس لیے یونان کا بچہ بچہ علوم وفنون سیکھتا تھا۔ اسی طرح زینو بھی بہت محنتی لڑکا تھا۔ اور افلاطون اور باقی نامور فلاسفرز کی طرح بننا چاہتا تھا۔ زینو کے باپ نے اپنے بیٹے کی فن خطابت پر اس کی تعریف کر کے اس زندگی میں مزید اسے آگے بڑھنے کے لیے ڈھارس بندھی۔ زینو کو لفظوں کا چناؤ بہت خوب آتا تھا۔

قدیم ترین دور کی تہذیبیں دریاؤں کے ساحلوں پر وجود میں آئیں اور پروان چڑھیں ہیں۔ دجلہ، فرات، نیل اور دریائے سندھ کی تہذیبیں دریا کنارے تھیں۔ ایرانیوں کی تاریخ اور تہذیبیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ ایران کی ریاست قدیم سے بہت پرانی سمجھی اور مانی جاتی ہے اور آج کی موجودہ ریاستیں جن میں آزر بائیجان، آرمینیا، ازبکستان، ترکمانستان، افغانستان اور تاجکستان بھی کبھی ایران کا حصے رہے ہیں۔ بلکہ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ چین، کرغرستان اور پاکستان کے کچھ علاقے بھی ایران میں شامل رہے ہیں۔ تہذیب کی تاریخ کے ضمن میں ناول نگار نے زینو کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے:

"تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ دنیا میں یونان کے علاوہ بھی لوگ بستے ہیں۔ یونان جب آثارِ قدیمہ کے ذریعے دریافت ہوا تو بہت پہلے کانسی ایجاد ہو چکی تھی جو نو حصے تانبے میں ایک حصہ قلعی ملانے سے بنتی ہے اور بہت مضبوط ہوتی ہے۔ دنیا کی قدیم ترین تہذیب، دجلہ اور فرات کے کنارے وجود میں آئی۔ دریائے نیل الٹا بہتا ہے یعنی جنوب سے شمال کی طرف اور اس کے کنارے آباد ہونے والی تہذیب بھی بہت پرانی ہے۔ ایران کی تہذیب بھی قدیم ہے اور اس کے مشرق میں بھارت کی تہذیب بہت پرانی ہے۔ بابل کا بادشاہ حمورابی جانتا تھا کہ ہر عمل کا ردِ عمل ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ اس لیے اُس نے بہت قدیم دور میں ضابطۂ قانون وضع کیا، جسے پہلا سمیری قانون کہنا چاہیے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت اس قانون کا حصہ تھا۔ اُس نے علاقوں کی انتظامی ذمہ داریوں اور عدالتوں کی کارروائی کا قانون بنایا۔"[۴۵]

تاریخ کیا ہے ؟ تاریخ کو کس زاویے سے دیکھا جاتا ہے اور اسے کیسے سوچا جاتا ہے۔ انسان کس طرح انفرادی طور پر کس طرح کسی تہذیب سے ربط قائم رکھتا ہے۔ زینو نے یونانی تہذیب کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ یونان آثارِ قدیمہ کے ذریعے وجود میں آیا ہے۔ کانسی پھر تانبا کتنے معدنیات یونان کی دھرتی سے جنم لیتے ہیں۔ زینو نے اپنی ذہانت اور بصیرت سے قدیم تہذیبوں کے بارے میں اپنے نظریۂ حیات اور افکار وخیالات کا اظہار کیا۔ قدیم ترین تہذیب، دجلہ، فرات اور دریائے نیل کے حوالے سے اپنی رائے دی۔ زینو نے کہا کہ سیاسی نظام، اقتصادی اور مذہبی معاملات اس تہذیب سے جڑا ہوا ہے۔ زینو نے قدیم دور کے ضابطۂ قانون کو وضع کیا۔

جو ہم چاہتے ہیں وہ بن بھی سکتے ہیں۔ یونانیوں نے اس بات کو ثابت کیا ہے۔ انھوں نے وقت کو ضائع نہیں کیا بلکہ اپنی ذہانتوں کا استعمال کیا ہے۔ کنفیوسش نے سیاست، اخلاقیات اور فلسفے کے حوالے سے چین کے لوگوں میں شعور پیدا کیا۔ جس طرح گوتم بدھا نے فلسفہ اور گیان، نروان کا سبق دیا اسی طرح زرتشت نے مذہبی شعور اور اخلاقیات کا درس بھارت کے معاشرے کو دیا اور اس حوالے سے فکر کو پروان چڑھایا۔ زرخیز ذہنوں کی باریک بینی کو ناول نگار نے اس طرح زینو سے کہلوایا ہے:

> "یونان زرخیز ذہنوں کی سرزمین ہے۔ بجا ہے مگر دنیا میں ہر جگہ زرخیز ذہن پائے جاتے تھے اور اب بھی موجود ہیں۔ ایران میں زرتشت نے ایک عالم کی سوچ بدل کر رکھ دی۔ کہا جاتا ہے کہ فیثا غورث بابل میں زرتشت سے ملا تھا اور زرتشت نے اسے فلکیات کے کئی نامعلوم اور روشن پہلوؤں سے آگاہ کیا تھا۔ بھارت میں مہابھارت اور رامائن بہت مضبوط رزمیہ صحیفے ہیں۔ وہاں کی ویدیں اتنی گنجلک ہیں کہ ذہین اُن کی پرتیں کھولتے ہوئے حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ دریائے گنگا کے پار دنیا کا آخری کنارہ نہیں۔ وہاں سے بہت دور ایک ملک چین ہے، جہاں لاؤزو اور کنفیوشس جیسے ذہن پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنی سوچ سے تہذیبوں کا پانسہ پلٹا۔"[۴۶]

تہذیبوں کی بلندی و پستی میں ترقی اور وسائل کی ضرورت ایک بنیادی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ یونانیوں نے اپنے معاشرے کو بہت محنت سے تیار کیا۔ اسی لیے یونان کے فلاسفرز نے اپنے ملک کے لیے اپنے ذہنوں کو استعمال کیا ہے۔ زینو نے کہا کہ ایران میں جس طرح زرتشت نے قابل عالم کی سوچ کو تبدیل کیا ہے۔ زرتشت وہ شخص ہے جو فلکیات کے حوالے سے فیثا غورث سے ملا تھا۔ اسی طرح بھارت میں بھی رامائن اور

مہابھارت ان کے لیے عقیدت کے حوالے سے ان کی زندگی کو نکھارنے کے لیے صحیفے ہیں۔اسی طرح چین میں کنفیوشش نے اپنے ملک کے لوگوں کے ذہن بدلے اور انھیں کامیابیاں کی طرف گامزن کیا۔

قدیم یونان کا عہد زرخیز تھا۔ اس عہد میں فلسفی اور بہت سے دانش وروں نے جنم لیا۔ جنھوں نے علوم وفنون کو مختلف خزانوں سے نوازا۔ اسی لیے یونانیوں کو اس بات پر آج بھی فخر ہے۔شاعری،ڈرامہ خاص طور پر تنقید اس خطے کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس عہد کے نظریات آج کے دورِ معاصر میں قابلِ توجہ سمجھے اور جانے جاتے ہیں۔افلاطون اور ارسطو۔لان جائی نس اور ہیوریس کے خیالات پر آج تک گرد نہیں جمی حالانکہ دوڈھائی ہزار سال بیت بھی گئے لیکن ان مشہور فلاسفرز کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ان کے نگارشات کا مطالعہ آج بھی کیا جاتا ہے اور ادبی تنقید میں ان کے بغیر ادب کا مطالعہ تشنہ رہتا ہے۔ارسطو شاعری اور ڈرامے کے حوالے سے افلاطون سے مختلف رائے رکھا کرتا تھا۔ارسطو نے "فن خطابت" اور شاعری کی تنقید کے حوالے سے "بوطیقا" جیسی کتابیں لکھیں۔ ارسطو نے تمام فنون، مجسمہ سازی،شاعری،موسیقی اور مصوری کی پذیرائی کی ہے۔ ارسطو کی نظر میں شاعر حالات وواقعات کا احاطہ کرتا ہے۔اس کے نزدیک شاعر فلاسفرز کی طرح کائنات،قدرت کی سچائیوں کو تلاش کرتا ہے اور شاعر انھی چیزوں کو اضافی خوبیوں کے ساتھ اپنے لفظوں میں پروتا ہے۔ارسطو کے مطابق شاعری زندگی کی نقل ہے۔ناول نگار نے شاعری کے حوالے سے ارسطو کی دسترس کو اس طرح سے بیان کیا ہے:

> "ارسطو نے سکندار کو پنڈار کی غنائی شاعری سے آشنا کیا۔اس کی نظم "پنڈاری" کے پیچیدہ عروض پر روشنی ڈالی۔ہومر،پنڈارااور سوفوکلیز کے تشبیہی اور استعاراتی نظام کا موازنہ کیا آرکٹینس کی "ایتھوپس" بھی زیرِ گفتگو رہی جو ٹرائے کی جنگ کا رزمیہ ہے۔یہ نظم اکلیس کی موت کا حال بیان کرتی ہے۔"[۷۶]

ارسطو نے سکندر کو یونانی شاعر پنڈار کی مترنم شاعری سنائی۔ارسطو کو شاعری پسند تھی اور ارسطو رشعرا کی شاعری سنایا کرتا تھا۔ہومر کی شاعری جو جنگی حالات پر مبنی ہوتی وہ سناتا۔سوفوکلیز ایک ڈرامہ نگار تھا۔اس کے ڈراموں میں یونانی ادب،مذہب دیومالائی،یونانی معاشرے کے بارے میں اور نفسیات،خطابت اور انسانی زندگی کی بے بسی جیسے موضوعات پر کہانی مبنی ہوتی تھیں۔آرکٹینس کی نظم ایتھوپس جو ٹرائے جنگ پر لکھی گئی اور جس میں اکلیس کی موت واقع ہو جاتی ہے؛اس کے غم میں لکھی گئی تھی۔ارسطو نے سکندر کو وہ نظم سنائی۔

vi۔ ماحولیات:

زمین، پانی، فضا، ہوا کو ماحول کہتے ہیں۔ ان میں طبعیاتی، حیاتیاتی اور کیمیائی اجزا اور عناصر شامل ہوتے ہیں۔ اس دُنیا میں جو کچھ ہے وہ ماحول میں آتا ہے۔ یہ آب و ہوا ابتدا سے انسانوں کا ساتھ دے رہی ہے اور انسان بھی اس سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا ہے۔ زینو کے باپ نے سن رکھا تھا کہ ایتھنز میں سمندر کے کنارے ایک ایسا جزیرہ ہے جسے آسیب زدہ کہا جاتا تھا اور جہاں کشتی ڈوب جاتی تھی لیکن زینو کے باپ نے اس بات کو آزمانے کے لیے اپنے ساتھ زینو اور اس کی ماں کو ساتھ لیا اور اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان رکھا اور چل دیے۔ آگے جزیرہ کیسا تھا ناول نگار نے اس کی منظر کشی یوں کی ہے:

> "جب یہ تینوں جزیرے پر اترے تو زینو کا باپ وہاں کی زرخیزی اور قدرتی دولت دیکھ کر دَنگ رہ گیا۔ انواع واقسام کے درخت تھے یونان میں شاہ بلوط، زتیون، جونیپر، صنوبر اور پاپلر کے درخت نظر آتے تھے مگر یہاں ان درختوں کے علاوہ ناریل کے درختوں کا جنگل تھا اور کچھ ایسے درخت بھی تھے جو ان لوگوں نے پہلے نہیں دیکھے تھے پرندوں کی بہت قسمیں تھیں۔ پھل دار درختوں کی بہتات تھی جزیرہ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اس میں صاف پانی کی ایک بہت جھیل تھی۔ میدان اور ٹیلے تھے۔ بعض ٹیلے چھوٹی پہاڑیوں کے برابر تھے۔"[۴۸]

ہر تہذیب کا اپنا جغرافیہ ہوتا ہے۔ میدان، پہاڑ، دریا، جنگل، پانی، سبزہ، پھل پھول، آب و ہوا، پرندے اور جذبات واحساسات اس علاقے کی خوب صورت زندگی کا وجود ہوتا ہے۔ جب زینو اپنے بیٹے اور بیوی کے ساتھ جزیرے پر اترا تو قدرت کے خوب صورت تحفوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اتنی حسین زمین، پہاڑ، سبزہ اور اتنے پھلوں کے درخت تھے جیسے یہ دلکش منظر اس کے منتظر تھے۔ زینو کے باپ کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ اس سے پہلے ایسا منظر کسی اور نے نہیں دیکھا ہو گا یقیناً وہ خود پہلا شخص ہے جس نے قدرتی حسن دیکھا ہے۔ زیتون کے درخت بے شمار تھے یعنی الگ جنگل لگ رہا تھا۔ یونان زیتون کے حوالے سے ساری دُنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ ناریل کے بھی بہت درخت جنگل کی تصویر کی طرح نظر آرہے تھے۔ پرندوں نے اس ماحول میں مزید دلکشی پیدا کی ہوئی تھی۔ بے شمار ہر نسل کے پرندے فضا میں گھوم رہے تھے اور کچھ زیتون ناریل کے درختوں کی ٹہنیوں پہ بیٹھے گیت گا رہے تھے۔ جھیل پر درختوں کے پتے تیر رہے جیسے دیکھنے والوں کی آنکھیں بھی اُن پتوں پہ بیٹھی تیر رہی ہوں۔ علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:

> ”یونان میں بحیرۂ روم کے خطے کی آب و ہوا ہے یعنی گرما میں خشک اور سرما میں بارش۔ سال بھر میں بیس انچ کے قریب بارش ہو جاتی ہے۔ مغربی حصے میں ایک طویل سلسلۂ کوہ ہے جو کوہ ایپس کی شاخ ہے۔ سب سے اونچا اولمپس کا ہے جس کی چوٹی کو یونانی اپنے دیوتاؤں کا مسکن سمجھتے تھے۔ اس کی بلندی نو ہزار سات سو چون فٹ ہے۔ پہاڑوں کے درمیان اور ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ زرخیز میدان ہیں جہاں گندم، انگور، نارنگی اور زیتون اُگائے جاتے ہیں۔ شدید جاڑے میں بھی کہرا نہیں پڑتا اس لئے گرم آب و ہوا کی بعض فصلیں بھی کاشت کی جاتی ہیں۔“[۴۹]

یورپ کے جنوب میں یونان بحیرۂ روم میں واقع ہے۔ یہاں کا موسم موسم گرما میں گرم اور خشک رہتا ہے اور سرما میں اس کو زرخیز اور خوب صورت بنانے کے لیے مارشیں ہوتی ہیں۔ یونان کے مغربی حصے میں پہاڑوں کا سلسلہ ہے جو یونانیوں کے مذہبی حوالے سے بھی جانے جاتے ہیں۔ سمندر کے ساتھ والی زمینیں بہت زرخیز ہوتی ہیں۔ مختلف قسم کے پھل بھی اس دھرتی کی زنیت بنتے ہیں۔ یونانی تہذیب میں یہ خطہ اُن کے لیے ایک حسین تحفہ ہے۔

وحید احمد آگے لکھتے ہیں:

> ”جزیرے پر رہتے ہوئے اب دو برس گزر چکے تھے موسمِ سرما کی چمکیلی دوپہر تھی چٹان کے چھجے پر کھڑے ہو کر زینو نے تیر سمندر میں داغا۔ کوہی ابابیل نے تعاقب کی۔ اب ابابیل اور تیر ہَوا میں ایک دوسرے کے اعتبار سے ساکن تھے۔ ابابیل نے اپنے پنجے تیر کی چوب میں پیوست کئے اور کوہی ابابیل کے پاؤں عموماً کمزور ہوا کرتے ہیں۔ ہَوا بہت تیز تھی ابابیل نے بہت دیر تک جھونکوں سے جنگ کی اور اس کشمکش میں سمندر میں دور نکل گئی۔ اب اُس کی سانس اکھڑ رہی تھی کچھ دیر بعد وہ پھڑ پھڑاتی ہوئی پانی کی سطح پر گری۔“[۵۰]

وحید احمد نے آب و ہوا کی تصویر کشی خوب کی اور ساتھ ساتھ زینو کے فلسفے کو بھی اس ماحول میں متعارف کرایا۔ زینو کے مطابق ہوا میں تیر ساکن رہتا ہے۔ اس کے ساتھ سفر کرنے والی چیز بھی ساکن رہتی ہے۔ یہ ایک دوسرے کے پاس پہنچنے کے لیے نصف فاصلہ طے کرتے ہیں۔ سردی کے دھوپ میں زینو جزیرے کی ایک چٹان پر چڑھ کر اکثر تیر سے پرندوں کا شکار کرتا تھا۔ زینو زیادہ تر ابابیل کا شکار کرتا تھا اس بار بھی اُس نے چٹان سے سمندر کی طرف تیر چھوڑا؛ تیر کے ساتھ ابابیل بھی تیز ہوا میں اڑ رہی تھی۔ لیکن دونوں اس ہوا میں ساکن تھے

پھر ابابیل نے اپنے پنجے تیر میں گاڑھے اور تیز ہوا سے لڑتے لڑتے آخر پانی پر گر گئی۔ یہ اور اس جیسے مختلف مناظر کی فضابندی سے ناول نگار نے زینو کے نظریات و خیالات کے ان عناصر ترکیبی کو قاری کے سامنے رکھا ہے جس کی وجہ سے زینو کے کائنات کے بارے میں خیالات متشکل ہوئے۔ اسی طرح زینو کے حوالے سے ایک نیا منظر کے۔ٹو کا ہے۔

پاکستان میں واقع بلند ترین چوٹی جو دُنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی ہے اسے کے۔ٹو کہا جاتا ہے۔ سلسلہ کوہ کوہمالیہ کا دورِ قدیم یونان سے لے کر ایشیا اور دوسرے براعظموں میں تہذیبی حوالے سے بہت اہم کردار رہا ہے اور آج بھی ہے۔ وحید احمد نے اپنے ناول 'زینو' میں کے۔ٹو چوٹی کے آب وہوا اور خاص کر رات کا منظر بڑا خوبصورت کھینچا ہے:

"کے۔ٹو کے دامن میں پورن ماشی کی چاندنی برف سے ٹکرا کر منعکس ہو رہی تھی۔ چاندنی کی اتنی بہتات تھی کہ رات کہنا دشوار تھا۔ مارچ کے مہینے کی یہ رات دیکھ کر دن شرماتا تھا۔ پہاڑ پر برف اور برف پر خاموشی کا ٹھہراؤ تھا۔ جب برف پر پاؤں کا دباؤ چرچراتا تو قدم بھر چاندنی بھری برف سنسناہٹ کے ساتھ فضا میں اُڑ کر تحلیل ہو جاتی تھی۔"[۵۱]

برف سے لدی ہوئی کے۔ٹو پہاڑی پر آسمان سے چاند اپنی پوری آب و تاب سے روشنی پھیلا رہا تھا۔ برف پر جب روشنی اپنا وجود پھیلاتی تھی تو برف اپنی خاموشی سے چمک رہی تھی اردگرد سارا علاقہ روشن تھا۔ یہ منظر ناول کے کردار تحسین اور ایوا اور برٹل جہاز سے دیکھ رہے تھے۔ یہ موسم مارچ کے مہینے کا تھا۔ رات ایسے لگ رہی تھی جیسے دن نے منہ نکال لیا ہو:

"دو ہزار سال پہلے کی دنیا آج کی دنیا سے یقیناً بہت زیادہ صاف ہو گی بلکہ ڈیڑھ سو سال پہلے کی دنیا بھی آج کی دنیا سے بہت زیادہ صاف ہو گی۔ زینو جب برف اوڑھ کر سویا تھا تو دنیا کی آب وہوا آئینے کی طرح شفاف تھی۔ وہ دو ہزار سال سے بھی زیادہ سویا رہا جب اُس نے آنکھ کھولی تو وہ اس جزیرے پر تھا جو ہمارے خیال میں دنیا کا صاف ترین جزیرہ ہے۔"[۵۲]

یونانی تہذیب دو ہزار سال قبل وجود میں آئی تھی۔ ناول نگار کا کردار زینو جب دو ہزار سال پہلے برف کے تودے کے نیچے آکر مر گیا تھا تو اس وقت بھی موسم بہت خوبصورت تھا آب و ہوا صاف شفاف تھی۔ اور جب ناول کا مرکزی کردار دوبارہ زندہ ہوا تو اُس وقت بھی دنیا آلودہ ہو چکی تھی۔

vii۔ سائنس:

سائنس لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی علم کے ہیں۔ انسانی کوششوں کا علم ہے جس کا تعلق کائنات کے ہر ذرے کی شناسائی کے حوالے سے ہے۔ کسی چیز کی دریافت اور مشاہدات کا نام سائنس ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اتارا تو اپنی ضروریات کے حصول انسان نے بہت سے مسائل کا سامنا کیا اور مشکلات کے حل کے لیے انسان نے اپنی عقل، علم سے کام لیا اور بہت سی چیزیں اپنی ضروریات کے اعتبار سے حاصل کیں۔ خوراک، لباس، رہنے کے لیے جگہ کا انتظام کیا اور ٹھوس، مائع اور گیس کو استعمال میں لایا۔ لکڑی کے پہیے سے لے کر لوہے کے پہیے تک سواری کا انتظام کرنا تا کہ میلوں لمبے فاصلے جلد طے کر سکیں۔ بود و باش کے حوالے سے موسموں کی مناسبت سے گرمی، سردی کی چیزوں اور اندھیروں میں روشنی کے لیے بجلی کا بندوبست کرنا تمام انسانی ضروریات سائنس کے مرہونِ منت ہے۔ انسانوں اور جانوروں کی بیماریوں کے حوالے سے ادویات کا بنانا انھیں استعمال میں لانا۔ گاڑی سے لے کر جہاز تک کی ضرورتوں کا پورا کرنا سائنسی علم کی بدولت ہی ممکن ہو پایا ہے۔ آج کے دور میں سائنس کی قدر و فضیلت کا اندازہ باخوبی اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہر پہلو سے سائنس نامیاتی طور پر ہماری زندگی سے جڑی ہوئی ہے۔ سائنسی علوم سے لاعلم رہنے کا مطلب تہذیب و تمدن سے لاعلم ہونے کے مترادف ہے؛ وحید احمد لکھتے ہیں:

> ”کاربن کے ایٹم میں چھ الیکٹران ہوتے ہیں۔ ایٹم مکمل ہونے کے لیے چار مزید الیکٹرانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ضرورت بھی کاربن ہی کے الیکٹران پوری کرتے ہیں۔ جو کاربن کے دوسرے ایٹموں سے مل کر شریک گرفتہ بند بناتے ہیں۔ کاربن کے ایٹموں کے یہ بند نہایت مضبوط اور دیرپا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہیرا نہایت سخت اور دائمی ہے۔“[۵۳]

یعنی کاربن ایک ایسا عنصر ہے جس کا تعلق انسانی زندگی کے ساتھ گہرا ہوتا ہے۔ ہر ایٹم کو مستقل رہنے کے لیے اپنے بیرونی مدار کو مکمل کرنا پڑتا ہے جس طرح کاربن ایٹم کو اپنی بیرونی مدار مکمل کرنے کے لیے الیکٹرانوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ کاربن، کاربن سے مل کر بانڈ بناتا ہے اور اسی وجہ سے وہ مضبوط اور دیر تک رہتا ہے۔ ہیرا بھی کاربن کی بیروپیت ہے۔ ہیرے میں کاربن کے ایٹم مل کر مخروطی شکل بناتے ہیں اس وجہ سے ہیرا بہت سخت اور مضبوط ہوتا ہے۔ جدید سائنس کے حوالے سے عبید الرحمان لکھتے ہیں:

> ”جدید سائنس کے مطابق سورج اور ستاروں میں جو مادے موجود ہیں وہ مستقل طور پر توانائی میں تبدیل ہو رہے ہیں اور یہی توانائی جو ان جوہروں سے خارج ہوتی ہے وہ حرارت اور روشنی کی شکل میں زمین تک پہنچ رہی ہے جس کی وجہ سے نئے ذرات پیدا ہوتے ہیں۔ جوہری تصور کا یہ نظریہ جابر بن حیان نے آج سے 1200 سال قبل پیش کیا تھا کہ زمین پر وجود میں آنے والی اشیاء کا تعلق ستاروں اور سیاروں سے ہے۔“[۵۴]

فلکیات اجزام فلکی کا مطالعہ ہے۔ باقی علوم کی طرح یہ بھی ایک علم ہے جس میں زمین، چاند اور سورج کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ چاند کی اپنی روشنی نہیں ہوتی ہے یہ زمین کے گرد گردش کے دوران سورج کی روشنی منعکس کر لیتا ہے۔ جب چاند کا اندھیرا حصہ زمین کی طرف ہوتا ہے تو کچھ حالتیں وجود میں آتی ہیں جن میں نیا چاند، تربیع اول ہلال، تربیع اول، احدب اول، پورا چاند (بدر)، احدب ثانی، تربیع ثانی، ہلال ۲۔ چاند سے زمین گول دکھتی ہے۔ اگر چاند سے زمین کو دیکھا جائے تو چاند سے بھی زیادہ روشن نظر آتی ہے۔ کیونکہ زمین چاند سے پچاس گنا بڑی ہے۔ زمین کا ستر فیصد حصہ پانی میں ہے اس لیے زمین نیلے رنگ کی وجہ سے بہت دل کش نظر آتی ہے۔ چاند سے اگر آسمان کی طرف دیکھا جائے تو آسمان سیاہ نظر آتا ہے۔ چاند جب سورج اور زمین کے درمیان آتا ہے تو ایک حصہ سورج کی روشنی پڑتی ہے دوسرا حصہ اندھیرے میں ہوتا ہے جب یہ حصہ زمین کی طرف ہوتا ہے تو چاند دکھائی نہیں دیتا ہے۔ جوں جوں چاند پر سورج کی روشنی پڑتی ہے تو یہ ہنسوے کی طرح لگتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ سارا گولہ روشن ہونے لگتا ہے۔ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کے عمل کو اشکالِ قمر کہتے ہیں۔ فلکیات کے حوالے سے ناول نگار کا کہنا ہے:

> ”فلکیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول وہ اجسام جو چاند سے بلند ہیں اور دوم جو چاند سے نیچے ہیں۔ چاند سے نیچے جو چیزیں ہیں، وہ پیدا ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں۔ چاند کے اوپر

> کے تمام اجسام مستقل ہیں۔یعنی نہ پیدا ہوتے ہیں اور نہ ہی زوال پذیر ہوتے ہیں۔زمین گول ہے اور کائنات کے مرکز میں ہے۔چاند کے نیچے موجود تمام اجسام چار عناصر سے بنے ہیں۔یہ عناصر مٹی، پانی، ہوا اور آگ ہیں۔لیکن فلکی اجسام ان عناصر سے نہیں بنے بلکہ ان کا مادہ مختلف ہے اُسے پانچواں عنصر کہا جاسکتا ہے۔"[۵۵]

زینو ایتھنز شہر میں جتنے دن رہا افلاطون کی اکیڈمی میں لیکچر سننے جاتا تھا۔ایک دن اکیڈمی میں فلکیات کے حوالے سے بات ہورہی تھی۔لیکچرار فلکیات کو دو حصوں میں تقسیم کے عمل کو بتا رہا ہوتا ہے کہ کس طرح چاند کے اوپر اور نیچے کے جو چیزیں ہیں وہ کس طرح بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہیں۔چاند سے بھی زمین گول نظر آتی ہے۔چاند کے نیچے کے جو چیزیں وہ چار عدد ہیں۔جن میں ہوا، پانی، مٹی اور آگ ہیں۔وہ اپنی ختم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ لیکن فلکیات کی چیزیں یا اجسام ان عناصر سے نہیں بنتے ہیں کیونکہ ان کے مادے کی ان سے بہت مختلف ہوتا ہے۔جسے ہم پانچواں عنصر کہہ سکتے ہیں۔

viii۔ جدیدیت:

ناولوں میں نت نئے تجربات بھی ہورہے ہیں جس سے نئی سوچ کا پتا چلتا ہے اور بہترین ناول پڑھنے کو ملتے ہیں۔ناولوں کا اسلوب اور زندگی کے مختلف مسائل کو منفرد زاویوں سے قاری کے سامنے بیان کرنا جدید ادب کی عکاس ہے۔جدیدیت میں مجسمہ سازی، موسیقی، مصوری، عمارت سازی ، نقش ونگار اور دیگر علوم وفنون پر رجحانات کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔جدیدیت اس رجحان کا نام ہے جس میں انسانی تجربات کا عمل دخل ہوتا ہے۔یہ تخلیقی اور تقلیدی حوالے سے عصری تقاضوں کا آئینہ دار ہے۔معاشرتی تبدیلیوں میں ثقافتی زندگی درجہ بہ درجہ ترقی کی طرف بڑھتی ہے۔ یونان ، مصر، ٹیکسلا ، گندھارا تہذیب، روم اور دیگر تہذیبوں کی بلندی اور پستی کے مراحل سے گزرتی رہی ہیں۔تہذیبیں درجہ بہ درجہ ترقی کی جانب بڑھتی رہی ہیں۔

جدیدیت اور تبدیلی کا عمل آج بھی جاری ہے۔جدیدیت میں تعلیم و صحت ، شہری زندگی، عورتوں کا معاشرتی مقام، اقدار ، رویے اور علوم فنون تہذیب شامل ہیں۔یہ ضروری اور اہمیت کی حامل چیزیں روایتی اور جدید معاشرے کی عکاسی اپنی تبدیلی کا اظہار وقت کے لحاظ سے کرتی ہیں۔روایتی معاشرے کا انحصار زیادہ تر زراعت پر رہا ہے جب کہ جدید معاشرے نے صنعتی حوالے سے اپنے قدم جمائے۔ہزاروں سال پہلے بھی لوگ

تہذیبوں کے اندر معاشرے کو جدید کہتے تھے اس کی وجہ تبدیلیوں کا درجہ بہ درجہ ہوتے رہنا ہے۔ شاعری ہو یا نثر کی کوئی بھی صنف جدیدیت کی مہر ضرور لگی ہوتی ہے۔ ناول نگار نے 'زینو' ناول میں بھی یونانی تہذیب کا جدید پس منظر پیش کیا ہے۔

"تہذیبوں کے عروج وزوال میں مادیت سے بالاتر نظر نہیں آتا۔ خواہ وہ سماجی ہو، سیاسی یا روحانی، مادی وسائل کا حصول معاشرتی ترقی کا باعث بنتا رہا اور قومیں اپنے عروج تک پہنچی رہیں۔ قوموں اور ریاستوں کو اپنے انجام تک پہنچاتی رہیں۔ "[۵۶]

زینو روزانہ کسی نہ کسی نئے موضوع بات کرتا تھا۔ مختلف مضامین کو ہفتے کے پڑھایا جاتا تھا۔ ایک نئی چیز متعارف کرائی جاتی تھی۔ دوسرے فلاسفہ کے ساتھ ریاست اور قوم کے حوالے سے بات چیت کرنا زینو کا معمول تھا۔ تہذیب میں سماجی، سیاسی اور مادی ترقی کے لیے سوچ بچار کرنا اور معاشرے کو بلند مقام پر لانا تاکہ یونان کی قوم کامیاب زندگی گزار سکے۔ یعنی قدیم یونان کی نظر جدید یونان کی طرف تھی۔ اور فلاسفہ کسی حد تک کامیاب ہوئے بھی تھے۔ انھوں نے ریاست کو ترقی کی طرف اور لوگوں کو میعار زندگی کی طرف بڑھایا۔

جس طرح ناول نگار نے یونانی تہذیب کو ذہنی طور پر زرخیز کہا ہے اسی طرح ٹیکسلا کی سرزمین کو زرخیز کہا ہے۔ جب زینو کی ملاقات چندر گپت موریہ کے وزیر چانکیہ سے ہوتی ہے۔ زینو کو اس نے ٹیکسلا کے بارے میں بتایا کہ یہاں کے لوگوں کے ذہن کس طرح سوچتے ہیں اور کتنے قابل ہیں کہ ٹیکسلا کی تہذیب میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ چانکیہ نے کچھ ذہین لوگوں کے نام اور اُن کے کارکردگی کے بارے میں زینو کو بتاتا ہے:

"ہاں! یہ جگہ علم کا گہوارہ ہے۔ یہاں چارک نے علم طب پہ کتاب لکھی۔ سشروت نے علمِ جراحی پر تحقیق کی۔ یہاں علم الاعضا کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ لوگ مردہ انسانی جسموں کو کھول کر نظامِ جسم پر تحقیق کرتے ہیں۔ یہاں جانوروں کے شفاخانے بھی ہیں۔ علمِ ریاضی سکھایا جاتا ہے شنّی اور دشملو کا استعمال یہاں کے علمِ ریاضی کا حصہ ہے۔ "[۵۷]

لفظ سوچوں کے لیے اس طرح کام کرتے ہیں جیسے مشکل کاموں کے حل کے لیے اوزار یا ہتھیار استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ چانکیہ نے زینو کو بتایا ٹیکسلا میں بہت ایسے لوگ بھی ہیں جو روز نئی سوچ سے نئی بات نکالتے

ہیں۔ اور نئی تحقیق کرتے ہیں اور بہت سے پیچیدہ مسائل کو حل کرتے ہیں۔ چانکیہ نے کہا کہ اسی دھرتی پہ چارک نے علمِ طب کے حوالے ٹیکسلا کے لوگوں کے لیے آسانیاں لایا اور لوگوں نے ان کی کتاب سے استفادہ حاصل کیا اور بہت سی بیماریوں سے بچے اور یہ چارک کی کامیابی اس کی محنت اور نئی سوچ پر منحصر ہے۔ اسی طرح جراحی فن کے حوالے سے سسشروت کا نام اس درسگاہ سے نکلا۔ یہاں کے لوگ حیاتیاتی کے علم کے اعتبار سے بہت لائق ہیں۔ جانوروں اور انسانوں مردہ جسموں کو چاک کر کے تحقیق کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ریاضی کے بارے میں بھی پڑھایا جاتا ہے۔ یعنی ٹیکسلا کی گندھارا تہذیب اپنے وقت کے لحاظ سے جدید تصور کی جاتی تھی۔

ناول "زینو" اپنے موضوع اور اسلوب کے حوالے سے جدید حسیات اور علمیات پر مبنی ناول ہے اور اس میں جدید دور کے مسائل کو بھی بیان کیا ہے اور دورِ قدیم ایک فلاسفر کو اس دور میں زندہ کیا ہے جو قدیم یونان کے ماحول اور آج کے دور میں جس طرح کا چلن ہے اسے دیکھ کر بہت حیران ہے۔ ناول میں جدید اس طرح بھی ہے کہ اس معاصر ملکی صورت حال کا تجزیہ بہت منفرد انداز سے کیا گیا ہے۔

دُنیا میں قیمتی ہیرے کی کان روس کے شہر 'ڈائمنڈ سٹی' مشرقی سائبریا میں واقع ہے۔ روس کو دوسری عالمی جنگ میں معیشت کا بہت نقصان ہوا تھا جسے اسی کان کے ذریعے پورا کیا گیا ہے اور آج روس کی معیشت بہت مضبوط ہے اور اس کا دارومدار اسی ہیرے کی کان پر ہے۔ صنعتی مقاصد کے لیے مصنوعی ہیرے تیار کیے جاتے ہیں۔ اس جدید دور میں مصنوعی ہیرے نے روس میں جتنی ترقی دی ہے؛ اس حوالے سے ناول نگار لکھتے ہیں:

> "روس کے سائنس دانوں نے مصنوعی ہیرے تیار کر لیے ہیں۔ یہ ہیرے درمیانے درجے کی واشنگ مشین کی جسامت کے آلے میں بنائے جاتے ہیں۔ جس میں دباؤ کی شدت ساڑھے آٹھ لاکھ پاؤنڈ اور درجہ حرارت تین ہزار فارن ہائیٹ ہوتا ہے۔ اس طرح ڈیڑھ قیراط کا ہیرا پچاس گھنٹوں میں تیار ہو جاتا ہے۔ اگرچہ مصنوعی ہیرا بالکل اصل معلوم ہوتا ہے۔"[۵۸]

روس میں مصنوعی ہیرے بنانے کے لیے ٹیکنالوجی کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ قدرتی ہیرا قدرتی طور پر جتنی حرارت، گرمی کے دباؤ میں بنتا ہے۔ روس کے سائنس دانوں نے لیب میں جدید مشینوں کے ذریعے مصنوعی ہیرے تیار کرنے شروع کر دیے ہیں اور اس کی وجہ اقتصادی نظام کو مضبوط بنانا ہے۔ دورِ قدیم میں تہذیبیں اپنی

ترقی کے لیے زراعت کی بہتری کے لیے اقدامات کرتی تھیں۔ لیکن اس جدید دور میں صنعت کو بہتر کر کے ترقی کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ مصنوعی ہیرے کو تقریباً پچاس گھنٹوں میں تیار کر لیا جاتا ہے جو اپنی شفافیت اور معیار کی وجہ سے قدرتی ہیروں کی طرح یعنی اصل لگتے ہیں۔ دھوپ سے حاصل ہونے والی توانائی شمسی توانائی کہلاتی ہے۔ دھوپ آسانی سے ملنے والی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ شمسی توانائی ایسی توانائی ہے جو ہر طرح کی آلودگی سے پاک ہوتی ہے۔ سورج کی روشنی سے دیگر ذرائع سے حاصل ہونے والی توانائی سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ حالانکہ سورج کی روشنی کا صرف چوتھائی حصہ زمین کو ملتا ہے۔ شمسی توانائی نے ثابت کر دیا ہے کہ اب اس کی ضرورت اس دورِ جدید میں بہت اہمیت رکھتی ہے اور اس کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دورِ قدیم میں معدنی تیل کو جلا کر انسان اپنی ضروریات پوری کرتے تھے۔ اقتصادی اعتبار سے شمسی توانائی نے بہت ترقی کی ہے۔ ایک گھر سے لے کر بڑے بڑے کارخانوں میں روزمرہ کے کاموں میں شمسی توانائی استعمال ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ گاڑی اور جہاز کو بھی شمسی توانائی کے ذریعے چلانے کے لیے اقدامات کیے گئے ہیں۔ شمسی توانائی سے تیار کیا گیا جہاز جسے سولر امپلس ٹو کہتے ہیں۔ جس سے دنیا کے گرد بھی چکر لگایا گیا ہے۔ جدید دور میں کن کن چیزوں کو استعمال میں لا کر آسانیاں پیدا کی جاتی ہیں۔ اس ناول میں ناول نگار نے اس تمام صورتِ حال کو یوں بیان کیا ہے۔:

"برٹل اکثر اپنے ذاتی خودکار طیارے پر سفر کرتا تھا۔ جس کا ڈیزائن اُس نے خود بنایا تھا۔ یہ طیارہ فوکر جہاز سے کچھ چھوٹا اور مخروطی شکل کا تھا۔ پیٹرول کے علاوہ شمسی اور ایٹمی توانائی سے چلتا تھا۔"[۵۹]

ناول نگار نے کتنی منفرد اور جدید طرز عمل میں زبان کا استعمال کیا ہے اور اس ناول کی یہ بہت خوب صورت انداز ہے۔ قاری کو پڑھتے ہوئے لذت کا احساس ہوتا ہے۔ برٹل سویڈن کا باشندہ ہے اور ایک امیر گھرانے سے اس کا تعلق ہے۔ برٹل کو ملک پاکستان بہت اچھا لگتا تھا اس لیے وہ پاکستان آنا چاہتا تھا۔ اس کا اپنا جہاز تھا جو ہیرے کی شکل جیسا تھا جو پیٹرول کے علاوہ شمسی توانائی اور ایٹمی توانائی سے با آسانی چلتا تھا۔ یہاں ناول نگار نے سائنس کی ترقی کا اشارہ بھی کیا ہے کہ اس جدید دور میں سائنس کی کتنی اہمیت ہے۔ یہ روز صبح اپنے بستر کی شکنیں چُنتا ہے۔ اس کی عادت ہے۔"[۴۴]

ناول نگار نے اس ناول میں فینٹسی سے کام لیتے ہوئے سائنس فکشن کے بعض اجزاء کو بھی ناول کا حصہ بنایا ہے اور آنے والے وقت سائنس کی مزید ترقیوں کے بارے میں اشارے دیے ہیں۔ جن سے ناول قدیم یونان فلسفے، جدید

مغربی علوم کے ساتھ ساتھ پیش بینی کا بھی حامل بن گیا ہے اور محض کہانی نہیں ہے بلکہ اس میں جدید ذہن کے سوالوں کو ایک نئی جہت دینے کی کوشش بھی ملتی ہے:

> ”بنے ہوئے انسان کو دوبارہ بنانا پڑے گا۔ میں نے انسان کے دماغ میں وہ مرکز دریافت کر لیا ہے جو انسان کو مستقل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ میں نے وہ کیمیاوی سفوف بھی بنالیا ہے، جس کے اثر سے انسان کا یہ مرکزِ فردایا فیوچر سنٹر کام کرنا چھوڑ دے گا۔ میں یہ بھی تحقیق کر لی ہے کہ اگر ذرا سفوف ہوا میں اڑایا جائے تو خود بخود افزائش کرے گا اور آکسیجن کے تمام مالیکیولوں کے ساتھ جُڑ جائے گا۔ سانس کے ذریعے اس کا اثر انسانی دماغ تک پہنچے گا اور کام کرے گا۔“[۶۰]

انسانی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے جس کو پورا کرنے کے لیے اسے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔ فلسفے کی بنیاد پر عملی زندگی نہیں رکھی جاسکتی ہے۔ اس کی بنیاد متحرک سوچ، متحرک لمحے اور متحرک عمل پر ہوتی ہے۔ یہاں انسانی سوچ کو بدلنے کے لیے مختلف حربے استعمال میں لائے جارہے ہیں۔ تجرتی علوم یعنی سائنس کے پیمانوں سے کھیل کر کسی ممکنہ حل تک پہنچنا کی کوشش ہے۔

حوالہ جات

۱۔ علی عباس جلالپوری، روایاتِ فلسفہ، تخلیقات لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۳۰

۲۔ ایضاً، ص ۱۰

۳۔ ایضاً، ص ۲۴

۴۔ صالحہ زریں، اُردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، سرسوتی پریس الٰہ آباد، ۲۰۰۰، ص ۳۲،۳۱

۵۔ وحید احمد، زینو، مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار فیصل آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۲۷

۶۔ ایضاً، ص ۳۲

۷۔ حبیب حق، یونانی تہذیب کی داستان، ص ۸۲

۸۔ وحید احمد، زینو، ص ۷۸، ۷۹

۹۔ ایضاً، ص ۴۰

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۲

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۸۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۳۹، ۱۴۰

۱۵۔ ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقا، (مترجم) تنویر جہاں، ص ۳۶

۱۶۔ ولی اللہ خاں، گندھارا، لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد، س ن، ص ۲۷

۱۷۔ وحید احمد، زینو، ص ۸۶، ۸۷

۱۸۔ ولی اللہ خاں، گندھارا، ص ۷۰

۱۹۔ وحید احمد، زینو، ص ۲۹، ۳۰

۲۰۔ علی عباس جلالپوری، روایاتِ تمدن قدیم، تخلیقات لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۳۷

۲۱۔ وحید احمد، زینو، ص ۳۳

۲۲۔ ایضاً، ص ۸۴

۲۳۔ ایضاً، ص۵۰

۲۴۔ ایضاً، ص۳۴،۳۵

۲۵۔ ایضاً، ص۱۵۸

۲۶۔ علی عباس جلالپوری، روایاتِ تمدن قدیم، ص۱۴۴

۲۷۔ وحید احمد، زینو، ص۱۶۹

۲۸۔ علی عباس جلالپوری، تاریخ کا نیا موڑ، تخلیقات لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۱۶۰

۲۹۔ وحید احمد، زینو، ص۱۶۹

۳۰۔ ایضاً، ص۱۷۱

۳۱۔ علی عباس جلالپوری، تاریخ کا نیا موڑ، ص۶۶

۳۲۔ وحید احمد، زینو، ص۱۷۵

۳۳۔ ایضاً، ص۱۳

۳۴۔ علی عباس جلالپوری، روایاتِ تمدن قدیم، ص۱۲۲

۳۵۔ وحید احمد، زینو، ص۱۰

۳۶۔ علی عباس جلالپوری، روایاتِ تمدن قدیم، ص۱۳۹

۳۷۔ وحید احمد، زینو، ص۱۰

۳۸۔ ایضاً، ص۱۹

۳۹۔ ایضاً، ص۱۷

۴۰۔ ایضاً، ص۳۵

۴۱۔ ایضاً، ص۹۴

۴۲۔ ایضاً، ص۸۵

۴۳۔ ولی اللہ خاں، گندھارا، ص۲۲

۴۴۔ وحید احمد، زینو، ص۲۱

۴۵۔ ایضاً، ص۳۲

۴۶۔ ایضاً، ص۳۳

۴۷۔ ایضاً، ص۴۰

۴۸۔ ایضاً، ص۴۶

۴۹۔ علی عباس جلالپوری، روایاتِ تمدن قدیم، ص ۲۲

۵۰۔ وحید احمد، زینو، ص ۲۲

۵۱۔ ایضاً، ص۱۱۳

۵۲۔ ایضاً، ص۱۳۸

۵۳۔ ایضاً، ص۸۹

۵۴۔ عبید الرحمن، ڈاکٹر، کچھ سائنس سے، لبرٹی پریس دریاگنج نئی دہلی، ۲۰۰۳، ص ۲۵

۵۵۔ وحید احمد، زینو، ص ۵۴

۵۶۔ ایضاً، ص ۳۲

۵۷۔ ایضاً، ص۸۵

۵۸۔ ایضاً، ص۹۰

۵۹۔ ایضاً، ص۹۴

۶۰۔ ایضاً، ص۹۸

باب سوم:

مندری والا کے تہذیبی عناصر

الف۔ مندری والا میں تہذیبی تنوع:

جس شہر، دیہات، گاؤں میں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔ مفادات اور منصوبوں کے ساتھ زندگی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ تہذیبی تنوع زندگی کو آزادانہ طور پر چلنے کی تلقین کرتا ہے اور ان راستوں پر چلتے ہوئے ایک دوسرے خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔ رنگ و نسل، مذہب، زبان، تہذیب وملک سے تعلق رکھنے والے لوگ آپس میں میل جول رکھتے ہیں اور معاشرے کو مضبوط بناتے ہیں۔ جس کی وجہ سے معاشرتی، معاشی انتظام کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

ہر تہذیب میں سماجی بات چیت کے لیے بنیادی معیار ضروری ہوتے ہیں۔ کسی بھی خطے میں رہنے کے لیے تنوع پایا جاتا ہے۔ رہن سہن کے طور اطور، مختلف لباس، لسانی مہارت، سماجی سرگرمیاں اور دوسری ضروری اشیا جیسے ناول نگار نے اپنے ناول 'مندری والا' میں تہذیبی تنوع کا منظر کھینچا ہے۔

> "کمرہ وسیع و عریض تھا جسے ہلکے بھورے رنگ کے کارپٹ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ کمرے کے وسط میں قرمزی رنگ کا منقش ایرانی قالین بچھا تھا جس پر مور کی شبیہہ نمایاں تھی۔ جس پلنگ پر وہ سرخ کمبل اوڑھے لیٹا تھا، اس کے چاروں پائے گرجے کے مخروطی میناروں کی طرح باریک ہو کر بلند ہوتے تھے۔ ہر مینار کے گرد سنہری پینٹ تھا جو کلس کی طرح جگمگاتا تھا۔ اُونچی چھت پر سفید اور دیواروں پر آف وائٹ ڈِس ٹمپر کی صفائی تھی۔"[1]

یہ منظر جو ایک تہذیب کا عکاس ہے۔ مندری والا جو کہ اس ناول کا ایک اہم کردار ہے۔ اس کی حویلی کے ایک کمرے کا منظر ہے۔ جمال مندری والا کے کمرے میں ہے اور ایک بڑے ہال نما کمرے میں ضروریات کی اشیا کو دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ خوب صورت فرنیچر، کارپٹ جو دوسرے ملک سے برآمدہ شدہ ہے۔ مور کی تصاویر جو کہ ثقافتی دلکشی کو ظاہر کرتی ہیں۔ اسی طرح بیڈ پر پڑے ہوئے کمبل بھی لال رنگ میں اچھے لگتے ہیں۔ پلنگ کا ڈائزین

بہت عمدہ ہوتا ہے جس کے چاروں جانب پائے کافی بڑے ہوتے ہیں جیسے مینار بنے ہوں۔ کرسٹین پرائس کے مطابق:

"بڑی بڑی تقریبات پر، خلیفہ اپنے محل میں سفرا کو شرف باریابی عطا کرتا تھا تو تخت شاہی کے کمرے کی محرابیں اور دروازوں پر ریشمی پردے ڈال دیئے جاتے تھے اور گلابی سنگ مرمر کے فرش پر پُرتکلف قالین بچھا دیئے جاتے تھے۔ دیواروں میں بڑے بڑے مربع طاقوں کے اندر گل دان یا دھات کے بخور دان رکھ دیئے جاتے تھے جن سے خوشبو دار مسالوں کا دھواں نکل کر ہوا کو معطر کر دیتا تھا۔ چھت کے شہتیروں سے بہت فانوس آویزاں ہوتے تھے۔"[۲]

کرسٹین پرائس نے مسلمانوں کی تاریخ میں حکمرانوں اور ان کے امراء کی تعمیر کی سرپرستی سے ان کے شغف کا جو اجمالی جائزہ لیا ہے اور نقاشی، کوزہ گری، کاشی کاری، سنگ تراشی، تزئین و آرائش کے گوناگوں طریقوں کے حوالے سے تصویر کشی کی ہے۔

پرانی تہذیبوں کے بہت بڑے بڑے محلات اور حویلیاں آج بھی کہیں کہیں موجود ہیں۔ لوگوں نے نئی حویلیاں پرانی طرز سے بھی بنا رکھی ہیں۔ اور کچھ علاقوں میں پرانی حویلیاں اور بڑے بڑے گھر خالی پڑے ہوئے ہیں۔ جنھیں لوگ آباد کرنے سے ڈرتے ہیں کیونکہ آسیب کے حوالے سے مشہور ہوتے ہیں۔ اس لیے وہاں لوگ نہیں رہتے۔ لیکن زیادہ تر لوگوں نے پرانی تہذیبوں کو آج بھی آباد کیا ہوا ہے۔ ناول نگار نے اس ناول 'مندری والا' میں تہذیبی تنوع کو بہت اجاگر کیا ہوا ہے۔ جیسے کہ اس ناول کا ہیرو جمال جب ایک کالی پہاڑی پر پہنچتا ہے۔ اور وہاں سارے گھر میں گھومتا ہے۔ وہ گھر کیا ایک حویلی ہوتی ہے۔ ناول کے کردار سے ناول نگار نے ایسے کہلوایا ہے:

"گھر کیا تھا ایک دُنیا تھی۔ جمال لیٹے لیٹے تھک جاتا تو پڑھنے لگتا۔ پڑھتے پڑھتے اُکتا جاتا تو گھر کے مختلف کمروں میں گھومنے لگتا۔ گھر تھا یا عجائب گھر۔ موٹی دیواروں اور اونچی چھتوں والے کئی کمرے تھے۔ ہر کمرے کا الگ ماحول تھا۔ انوکھا رنگ ڈھنگ اور جداگانہ تیور۔ وہ زیادہ تر اس دومنزلہ گھر کی نچلی منزل میں گھومتا پھرتا اور دلچسپی سے ہر چیز دیکھتا رہتا۔"[۳]

مندری والا کا گھر ایک حویلی کی مانند تھا۔ بہت وسیع اور کشادہ گھر تھا۔ جمال جب آرام کر کے تھک جاتا پڑھتے اکتا جاتا تو مندری والا کے گھر کے کمروں اور بر آمدوں میں گھومتا رہتا۔ اس گھر کی دیواریں قدیم دور کے بادشاہوں کی حویلیوں کی طرح بہت زیادہ موٹی اور مضبوط تھیں اور چھت بہت اونچے تھے۔ اس حویلی کی خاص بات یہ تھی کہ اس کا ہر کمرہ دوسرے کمرے سے مختلف تھا۔ یعنی کمرے میں پڑی چیزیں بھی دوسرے کمروں سے بہت مختلف ہوتی تھیں۔ جمال بڑی دلچسپی سے ان کمروں میں گھومتا اور مندری والا کی بنائی ہوئی چیزوں کو غور سے دیکھتا اور حیران ہوتا۔

مختلف تہذیبوں نے موسیقی کو کسی نہ کسی حوالے سے اپنی تہذیب سے جوڑا ہے۔ موسیقی آواز کا فن ہے اور اس کے ساتھ ساتھ رقص بھی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ ہندوستانی تاریخ میں موسیقی کی تاریخ بہت پرانی ہے ۔موسیقی کا فن ہندوستان میں ہزاروں سال پہلے سے پھیلا پھولا ہے اور آج کے دور میں بھی عروج پر ہے۔ کثیر تعداد میں موسیقی کے آلات ساری دنیا میں موجود ہیں ۔ دورِ قدیم میں بھی عمارتوں پر موسیقی کے حوالے سے نقش و نگار، مجسمہ سازی کے طور پر اور تصاویر آویزاں کر کے موسیقی کے فن کو تہذیب کی تنوع کی حیثیت سے عیاں ہے:

"دوسرے کونے میں ایک نمدہ قالین اپنی وسعت پر سازوسامان سجائے تھا۔ سارنگی، سرمنڈل، ہارمونیم، ستار، گٹار، طبلے، دف، مجیرے اور ایک طرف ڈرم اور اونگا بونگا۔ چھریرے اور صندلی بدن کا ایک شخص ہتھوڑی اور اُنگلی کے جھٹکوں سے طبلہ سُر میں لا رہا تھا۔ ایک ڈھلکے بدن اور ٹھہری آنکھوں والا شخص ہارمونیم پر گاہے گاہے بھیرویں کی آروہی اور امروہی دکھاتا اور پھر اپنی اُنگلی کومل گندھار پر روک لیتا۔ پاس ہی ایک اور پستہ قد آدمی جلترنگ کے پیالے سجانے میں مصروف تھا۔"[۴۴]

موسیقی کی محفل سجانے کے لیے بھرپور تیاری کی جاتی تھی۔ ایک بڑے ہال نما کمرے میں قالین بچھائی ہوتی تھیں اور دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگا دیا جاتے تھے۔ جن پر آنے والے مہمان ٹیک لگا کے موسیقی کی محفل سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ موسیقی کے مختلف آلات ایک جگہ سجائے ہوتے تھے۔ رقص بھی ہوتا اور گانے بھی گائے جاتے اور اس کے ساتھ ساتھ وہاں موجود شراب نوشی بھی کرتے تھے۔ موسیقی کے حوالے سے ایک کردار کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

”آئی لو ایسٹرن میوزک۔ یہ وجدانی موسیقی ہے۔ ہوا میں گرہ لگاتی ہے۔ ریلے کی طرح بہا لے جاتی ہے۔ اس میں صوفیوں کے پشمینے کا نّگھ اور رِشیوں کی راتوں کی تپسیا ہے۔ اس میں مزاروں کی سبز چادروں کی خوشبو اور اگر بتیوں کا دُھواں ہے۔ اس میں کرشن کی نے نوازی کی حکایت اور گوپیوں کے رقص کی شکایت ہے۔ اس میں سونیا کی وارفتگی ہے۔“[۵]

وحید احمد لکھتے ہیں:

”ماس ماسٹر نے ٹھہری نظروں سے بابو بنگالی کو دیکھا۔ طبلے کی کھال پر انگلیوں کے پنچھی پھڑ پھڑائے۔ دھبد ھباہٹ کے ساتھ تال کا پہاڑی ریلا سنگیت کے دو آبے میں شامل ہوا تو سم کے ساتھ سونینا کا پہلا پیر پرتھوی سے ٹکرایا۔ جھنکار کی آبشار جمال کی سماعت پر پڑی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کمرہ رقص اور موسیقی سے لرزنے لگا۔“[۶]

جمال نے دیکھا کہ یہاں کے لوگوں کو موسیقی سے بہت دلچسپی ہے۔ ہر فرد موسیقی کے حوالے سے مہارت رکھتا ہے۔ ماس ماسٹر، بنگالی اور سونیا ایسے اس ناول کے کردار ہیں جو موسیقی سے جڑے ہوئے ہیں۔ طبلہ بجانا۔ موسیقی کالی پہاڑی کی تہذیب کا حصہ تھا۔

فنونِ لطیفہ میں فنِ موسیقی کا ایک خاص مقام ہے۔ انسانی تمدن و معاشرت کی ترقیوں کے ساتھ ساتھ اس فن کو بھی بتدریج ترقی ملی ہے۔ موسیقی کے حوالے سے شفق سوپوری لکھتے ہیں:

”انسانی تہذیب اپنی ارتقائی صورت میں زبان، مقام، عقائد اور اقوام کے نام پر قوس قزح کی طرح پھیلتی ہے۔ اس ارتقائی سفر میں ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب فطرت کی اثر انگیزی اور انسانی جبلتوں کے تحرک کے سبب انسان بے خودی کے جذبات سے سرشار ہوتا ہے۔ یہ سرشاری جب ترتیب و تسلسل کے ساتھ اعضائی حرکات کی صورت میں رونما ہوتی ہے تو اسے رقص کہتے ہیں اور یہی سرشاری جب ترتیب و تسلسل کے ساتھ نغمہ و آہنگ میں ڈھل کر سامنے آتی ہے تو اسے موسیقی کہتے ہیں۔ اسی لئے ہر قوم کی تاریخ میں موسیقی بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور ہر قوم موسیقی سے متعلق اپنی اپنی توضیحات پیش کرتی ہے۔“[۷]

انسانی تہذیب میں کچھ خواص ایسے ہوتے ہیں جو نوع انسانی کے ساتھ ساتھ ہیں۔ جیسے ہنسنا انسانی خاصہ ہے اور کچھ ایسے خواص بھی ہیں جو حیوان کی جنس میں پائے جاتے ہیں۔ ہر جاندار سانس لیتا ہے۔ انہیں خواص میں موسیقی بھی ہے۔

پرانے دور میں واٹر مِل یعنی پن چکی اس علاقے میں نہر یا ندی کے پانی ایک ڈھلانی سطح سے نیچے گرتا ہے۔ وہاں لکڑی، گارے اور پتھروں کے استعمال سے ایک کوٹھڑی بنائی جاتی ہے۔ پانی کے حجم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دو، تین سے پانچ بھی چکیاں استعمال میں لائی جاتی تھیں۔ کوٹھڑی یا کمرے کے اندر آٹے اور غلے کی بوریوں کا انبار ہوتا تھا۔ گاؤں کے لوگ ایک دن اپنی گندم یا مکئی کی بوری رکھ جاتے تھے۔ دوسرے یا تیسرے دن آکر گندم یا مکئی کے دانوں کو آٹے کی صورت میں لے جاتے تھے۔ وحید احمد اپنے اس ناول میں پن چکی کا ذکر اپنے کردار کے ذریعے کرتے ہیں۔ دریا کے کنارے ایک کمرہ تھا۔ پن چکی کے زور پر کمرے میں گیہوں پیسا جاتا تھا۔[۷]

جمال نے دریا کے کنارے پن چکی کو بھی دیکھا جہاں کالی پہاڑی کے لوگ گندم کا آٹا تیار کروانے آتے تھے۔ پن چکی بھی ایک پرانی تہذیب کی عکاس ہے۔ کالی پہاڑی کے لوگوں نے شہر کے لوگوں کے ساتھ مقابلے کی زندگی گزارنے کی ٹھانی تھی۔ ہر حوالے سے جمال نے دیکھا کہ اس سماج کے لوگ کچھ نہ کچھ کرتے نظر آتے ہیں:

> "جب میں چلی جاؤں تو اداس نہ ہونا۔ ایک ہی بار زور سے رو لینا۔ کارخانے میں میری ارتھی بنانا۔ مرگھٹ میں میری چتا کو آگ لگانا۔ پھر میرے پھول چُننا۔ مٹی کی گڈوی میں میری استھیاں ڈال کر اپنے ہاتھ سے بُنا سوت لپیٹنا اس ڈوری کے ساتھ اور دریا میں اپنے ہاتھوں سے بہانا۔"[۸]

مندرجہ بالا اقتباس میں مختلف سماجی، مذہبی اور معاشرتی سرگرمیوں کی طرف گہرائی اور گیرائی سے اشارے کیے گئے ہیں۔

> "ڈائننگ ٹیبل کے پیچھے کا دروازہ کھول کر ایک لڑکی کمرے میں داخل ہو چکی تھی اس کے ہاتھوں میں چائے کا ٹرے تھا۔ لڑکی نے سرخ رنگ کی شال اوڑھ رکھی تھی۔ اس کے کٹے ہوئے بال بیک وقت بکھرے اور سنورے ہوئے تھے۔"[۹]

شینا مندری والا کی بیٹی ہے۔ جو جمال کے لیے چائے لے کر کمرے میں آتی ہے اور اس نے لال رنگ کے کپڑے پہن ہوتے ہیں۔ مارکیٹوں میں کھانے کی چیزوں کو گلنے سڑنے سے بچاؤ کے لیے مختلف طریقوں سے خشک کر کے انھیں مختلف قسم کے پیکٹوں میں بند کرنے کے محفوظ کیا جاتا ہے۔ اس طرح باآسانی چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ شہر سے دور دراز مقامات پر رہتے ہیں وہ روزانہ شہر کی مارکیٹوں کی طرف چکر نہیں لگا سکتے۔ اس لیے وہ ایک ہفتے، پندرہ دنوں یا ایک ماہ کے لیے ضروریات کی چیزیں خرید کے گھر میں جمع کر لیتے ہیں۔ ناول نگار نے اس ناول 'مندری والا' میں بھی ایک اہم کردار مندری والا نے اپنے حویلی کے لیے ایک ہفتے کے لیے ضروری چیزوں کو خریدا ناول نگار لکھتے ہیں:

> "وہ ہر ہفتے ہیلی کاپٹر پر کہیں جاتا اور وہاں سے تمام لوگوں کی ضروریاتِ زندگی کی اشیاء لاتا تھا آٹا، چاول، سبزیاں، پھل، مسالے، کھانے اور جلانے کا تیل، مختلف ناپ کے کپڑے، جوتے، سنیاسی، ادویات، مختلف نمبر کے چشمے، صابن، تولیے، مفلر، ٹوپیاں، موزے، شیو کا سامان اور بہت سی چیزیں۔"[۱۰]

مندری والا اپنی حویلی کے لیے ہر ہفتے زندگی کی تمام ضروریات کی چیزیں خرید کے لاتا ہے۔ جن میں کھانے، پینے کے ساتھ ساتھ لباس اور ادویات وغیرہ کا بندوبست کرتا ہے۔

قرآن پاک کی سورۃ رحمن، سورۃ جن، سورۃ نمل، سورۃ سبا، سورۃ کہف اور سورۃ حجر میں جنات کے حوالے ذکر موجود ہے۔ اور یہ مخلوق انسانوں سے بھی پہلے بھی دنیا میں موجود تھی۔ مندرجہ بالا سورتوں کی تفسیر میں اس مخلوق کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ یعنی ان کا وجود آگ سے بنایا گیا ہے۔ یہ حق و باطل اور علم وادراک کی جانچ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ یہ جنات بھی گروہ کی صورت میں موجود ہوتے ہیں ایک مومن اور دوسرا مشرک ہوتا ہے۔ جنات میں غیبی خبریں سننے کی صلاحیت اور آسمانوں تک پہنچنے کی طاقت بھی ہوتی ہے:

> "یہی والا—— ہاں یہی والا۔ تمہارے سر پر سایہ ہے بچے! اور سایہ بھی بہت گہرا، ساون کی گھٹا جیسا۔ اماوس کی رات جیسا۔ یہاں نہ جوتش چلے گا نہ رمل۔ نہ ہندسہ چلے گا نہ جمل۔ نہ تعویذ چلے گا نہ گنڈا۔ یہاں چلے گا عمل۔ بلی کے بھاگون چھینکا ٹوٹا۔ تم ٹھیک جگہ پر آئے ہو۔ میں تمہارا سایہ اُتاروں گا۔ تمہارے سائے کا ایک حصہ پاؤں سے کھینچ کر اُتاروں گا۔ کچھ

دِن اپنے پاس رکھوں گا۔ عمل کروں گا اور تمہیں واپس بھیج دوں گا۔ تمہارا سایہ جتنے دن
تمہارے سائے کا کچھ حصہ میرے پاس رہے گا۔ تمہارا سایہ ہلکا ہو گا۔"[۱۱]

مندری والا جو کہ ایک اہم کردار ہے۔ وہ اس علاقے کا ایسا شخص ہے جو ہر علم جانتا ہے۔ کچھ مخصوص لوگ اسے شاہ جی کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ اور یہ مخصوص لوگ ہیں جنھیں جنات کا سایہ ہوتا ہے یا جادو کا کوئی معاملہ ہوتا ہے اور ایسے لوگ مندری والا کے پاس آتے ہیں اور اپنا روحانی علاج کراتے ہیں۔ ایک دن ایک شخص مندری والا کے پاس آتا ہے اور منت سماجت کرنے لگتا ہے کہ میرا علاج کر دیں۔ مندری والا پہلے بہت انکار کرتا ہے لیکن اس شخص کی حالت دیکھ کر اسے کہتا ہے کہ یہاں کسی جوتش اور رمل کا معاملہ نہیں ہے۔ تم پر جادو نہیں ہوا ہے نہ کسی نے تعویذ کیا ہے۔ تم پر کسی چیز کا سایہ ہے۔ جنات کا سایہ میں تمہارا علاج کروں گا تم فکر مت کرو۔ مندری والا اسے کہتا ہے کہ اس سایے کا ایک حصہ پاؤں سے کھینچ کے اتاروں گا۔ کچھ دن اسے اپنے پاس رکھوں گا ۔اس پر اپنا عمل کروں گا پھر لوٹا دوں گا۔

معاشرے کے لوگ جب اپنے اپنے حصے کا کام نہیں کریں گے تو اس طرح کی صورتِ حال کا سامنا ہر فرد کو کرنا پڑتا ہے۔ جب ریاستی نظام حکمرانوں سے نہیں چل پاتا تو اس معاشرے کے نقش مٹ جاتے ہیں:

> "دیکھیں بزرگو! جب آپ نے یہ طے ہی کر لیا کہ دُنیا کا نظام مردار جسم کی طرح ہے۔ بُو دیتا ہے۔ تو آپ سماج میں جایئے اور نظام کو درست کیجیے یا کم از کم درست کرنے کی کوشش کیجیے۔ یہ تو ہتھیار پھینک دینے والی بات ہوئی کہ ساری دُنیا کو بدبو میں چھوڑ کر خود پہاڑ پر گئے۔ کام نہ کاج۔ کھاتے رہے گھومتے رہے اور سوتے رہے۔ معذرت کے ساتھ عرض کروں کہ یہ بزدلی ہے۔ چھٹکارا ہے ۔حقیقت سے منہ چھپانا ہے۔ بلکہ منہ کی اوٹ کرنا ہے۔"[۱۲]

جمال کو بوڑھے بابا کی بات پسند نہیں آئی کہ شہر میں بو آتی ہے۔ اسے اس بات کو علم تھا کہ بوڑھا آدمی اس معاشرے کی بات کر رہا ہے اس حکومت کی بات کر رہا ہے اگر حکمران درست سمت نہ ہوں تو ملک بھی نہیں چلتا نظام درم برہم ہو کے رہ جاتا ہے۔

آزاد ملک سماجی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی حوالے سے مضبوط ہونا چاہیے۔ اگر حکومت سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے کمزور ہو تو اس کا نظام مر دار جسم کی مانند ہو تا ہے۔ سلیم احمد لکھتے ہیں:

"ہماری سماجی زندگی کو ہم ایک "کل" میں منقسم کر سکتے ہیں۔ مثلاً سیاسی جزو، اخلاقی جزو وغیرہ پھر ان اجزا کو بھی اور چھوٹے چھوٹے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔، مثلاً سیاسی جزو کی تقسیم ان مختلف طبقوں کے مفاد کی رو سے کی جا سکتی ہے جن کے مجموعے کو ہم ایک معاشرتی کل کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ اور یہ طبقے بھی اپنے معاشی وسائل اور پیشوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف رجحانات رکھتے ہیں۔"[۱۳]

سماجی زندگی کے اہم جز و اگر منتشر ہو جائیں گے تو یقیناً ہمارا پورا سماج انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ آزاد ملک میں آزادی رائے سے ایک منظم اور مستقل اصولوں کے تحت مناسب سماجی ماحول بنانے کی کوشش کی جائے تا کہ مختلف منفی رجحانات کے عمل و ردِ عمل میں ایک متوازن اور اہم آہنگ معاشرے کی بنیاد رکھی جا سکے جس سے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور اخلاقی قدریں ایک متنوع اور رنگارنگ زندگی بنانے میں اہم کردار ادا کریں۔ وحید احمد ناول مندری والا کے اہم کردار جمال سے کہلواتے ہیں:

"آپ ملک کے عظیم دانش ور ہیں جمال صاحب اور پھر الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں آپ کا خاصا اثر ورسوخ ہے۔ حکومت آپ کی قدر کرتی ہے اور احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔"[۱۴]

جمال ایک ادیب دانشور ہو تا ہے اور پرنٹ میڈیا میں اس کا بڑا نام ہو تا ہے۔ وزیر اعظم کے مشیر نے جمال کی تعریف کی تا کہ وہ اُن کے کام آ سکے۔ حکومت کو جب کسی کی ضرورت پڑتی ہے جو ان کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکے تو اس کے لیے حکومت بچوں کے ساتھ بچوں والا رویہ اور بڑوں، بوڑھوں کے ساتھ انہی کے جیسا برتاؤ کرتی ہے تا کہ وہ اپنا کام ان سے نکلوا سکے۔ ناول نگار نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ حکومت جو کہ بد بو دار ہو چکی ہے اور طرح طرح کے حربے استعمال کر رہی ہے۔ ناول نگار نے اس ناول کے ہیرو جمال جو کہ ایک باعزت ہے اس کا مقام معاشرے میں اہمیت رکھتا ہے۔ اسے بھی استعمال میں لایا جا رہا ہے۔

بر اعظم ایشیا ہو، یورپ ہو یا افریقہ کا اگر کوئی ملک محفوظ نہیں تو معاشرہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ لوگ ذہنی طور پر کمزور ہو جاتے ہیں۔ سیاسی نظام، اقتصادی نظام جو کسی بھی سماج کے لیے ایک ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ ایک ملک کی تباہی سے دُنیا کے باقی ممالک بھی خود کو غیر محفوظ محسوس کرتے ہیں۔ یہ دیمک سے

بھی خطرے ناک بیماری پوری طرح اس سماج کو لگ گئی ہے جو اسے تباہ و برباد کرتی جاری ہے۔ دہشت گردی کا کوئی بھی مقصد ہو۔ کسی بھی ملک کا داخلی معاملہ ہو یا کوئی خارجی مسئلہ ساری دنیا اس سے خوف زدہ ہوتی ہے۔ لوگ غیر محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ریاستی اقدامات ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔ دہشت گردوں نے جہاں بم رکھنا ہوتا ہے اور اسے پھاڑنا ہوتا ہے وہ کر گزرتے ہیں۔ دن دہاڑے ایسی کارروائیاں کر دی جاتی ہیں۔ اور ریاستی حکمران اس سے غافل ہوتے ہیں۔ سینکڑوں لوگ مارے جاتے ہیں۔ جگہ جگہ خون پھیلا ہوتا ہے۔ ملک کا معاشی نظام تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ سماجی رتبے سے لے کر سیاست، انصاف، ریاستی طاقت تک سب کچھ بک جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے دہشت گردی بڑھتی جاتی ہے۔ جب ریاستی حکمران اور دنیا کے بڑے بڑے ممالک کے حکمران آپس میں بیٹھ کر اس مسئلے کو حل نہیں کریں گے تو ساری دنیا اس خوف میں رہے گی۔ غربت، محرومی، بھوک، مہنگائی اور بے روزگاری اسی طرح ایک بیماری بن کر معاشرے کے ہر فرد کو لگے گی۔ اور دہشت گرد اسی طرح بنتے رہیں گے۔ ناول نگار نے اس ناول میں دہشت گردی کے حوالے سے ملکی حالات کو بیان کیا ہے:

> ”خون فرش پر پھیل گیا ہے۔ آتش فشاں کا دہانہ پھٹ گیا ہے۔ خون لاوے مل کر اپنا رنگ اُڑا رہا ہے۔ گری ہوئی آنکھیں لاوے میں پگھل رہی ہیں۔ گوشت کے چیتھڑے ستونوں پر چپکے ہوئے ہیں۔ لہرا رہے ہیں۔ میں چکنے فرش پر پھسل رہا ہوں۔ خون کی آبشار کے ساتھ میں بڑے دروازے سے وادی میں گروں گا۔ خون کا ریلا بہت تیز ہے۔ نیچے دریا کے پانی میں مجھے چابی نظر آ رہی ہے۔ جو میری کمر سے نکل کر بہہ گئی تھی۔“[۱۵]

یہ اقتباس بھی خون سے رنگا ہوا ہے۔ جمال کے سامنے یہ منظر رونما ہوا ہے ایک جلسے کے دوران جہاں وزیر اعظم نے خطاب کرنا تھا: کیا مذہبی پس منظر کے علاوہ بھی خودکش حملے کا کوئی جواز ہے؟۔[۱۶]

دُنیا میں مختلف ممالک کے دشمن عناصر لوگ بچوں کی خودکش حملوں کے لیے تیار کرتے ہیں۔ خودکش حملوں آوروں کو پاکستان کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک میں کارروائیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ خودکش حملوں کی تربیت بچوں کو چھوٹی سی عمر میں انسانی دشمن لوگ دیتے ہیں۔ اور مذہب کی آڑ میں بھی بچوں کو استعمال میں لاتے ہیں۔ انھیں جنت کے حوالے سے لیکچر دیا جاتا ہے کہ اور جنت کے منظر کو بیان کیا جاتا ہے اور ان کم عمروں بچوں کے ذہنی طاقت کو اپنے قابو میں کر کے انھیں استعمال کر لیا جاتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا شک نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے پیچھے اگر مذہبی لوگوں کا ہاتھ ہے تو وہ لوگ نام کے مذہبی ہوتے ہیں۔ وہ کسی حوالے سے اللہ اور اس کے رسول کے چاہنے والے نہیں

ہوتے۔ کیونکہ اسلام واحد ایک ایسا مذہب ہے جو انسانیت بڑا علمبر دار ہے۔ ناول نگار نے ناول کے اہم کردار جمال کا ایک خود کش حملہ آور سے گفتگو کو اس طرح بیان کیا ہے۔

”تمہارے بڑے بوڑھوں نے تمہیں تباہی کا علم سکھایا۔ تمہاری کایا کلپ کی۔ تمہارے سر پر موت کا بھوت سوار کیا۔ تمہیں اجتماعی موت سے آشنا کیا۔ مگر مجھے ایک بات بالکل سمجھ نہیں آتی کہ آخر وہ سکھانے والے خود اس کارِ خیر پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ پکی عمروں کے لوگ آخر خود کش حملہ کیوں نہیں کرتے۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہ نوجوانوں کے سیلابی جذبات سے کھیل کر انھیں تباہی پر اُکساتے ہیں تو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔“[۲]

جمال نے خود کش حملہ آور بچے سے کہا کہ یہاں اس کام کے لیے تمہارے بڑوں نے سکھایا ہے۔ تمہارا ذہن اس طرح تیار کیا ہے کہ تم اپنے سوچ کو مار کر ان کی باتوں کو یاد رکھ کر موت کی طرف بڑھ رہے ہو۔ تمہیں بہت لوگوں کا قتل کرنے کے لیے کہا جاتا ہے اور بنا سوچے سمجھے اس کام کے لیے تیار ہو جاتے ہو۔ جمال نے کہا کہ اس بات کی مجھے نہیں سمجھ نہیں آتی کہ جو لوگ آپ لوگوں کو اس کام کے لیے تیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کام بہت نیک کام ہے تو وہ لوگ اس کارِ خیر میں حصہ کیوں نہیں لیتے۔ ناول نگار نے یہاں ایک لائن جمال سے کہلوائی ہے جس کے اندر ایسے لوگوں کو بے نقاب کیا ہے۔ جمال نے کہا کہ خود کش حملے پکی عمر کے لوگ کیوں نہیں کرتے جو لوگ بچوں کو اس کام کے لیے تیار کرتے ہیں وہ خود کیوں نہیں خود کش حملہ کرتے ؟ بس نوجوانوں کی نسل کشی ہو رہی ہے۔ انھیں کیوں استعمال کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کا جواب کون دے۔

i۔ مندری والا کے کردار اور ان کا تجزیاتی مطالعہ :

مندری والا ناول میں بہت کرداروں نے اس کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔ مندری والا میں خود مندری والا بھی ایک اہم کردار ہے اور جمال جو پورے ناول میں ایک سائے کی طرح ہر کردار کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے علاوہ مندری والا کی بیٹی، بیوی اور ایک بازوؤالا شخص بھی جو اپنے کردار کے حوالے سے پر اسرار سا بھی ہے۔ اس کے علاوہ مندری والا میں کارخانے میں کام کرنے والے بھی شامل ہیں۔

جمال ایک دلیر آدمی تھا اور ایک افسر تھا جو کالی پہاڑی پر رہتے ہوئے بہت سی باتوں کو سیکھ چکا تھا۔ اور شہر آنے کے بعد اس نے ایک خود کش حملہ آور کو پکڑا تھا جو اسے کالی پہاڑی پر ملا تھا۔ اور وہاں رہ کر وہ شہر میں حملے کی

سوچ رہا تھا۔ مندرجہ ذیل اس ناول کے اقتباس میں وہ پولیس والوں سے کہہ رہا ہے:" اس کی باڑودی جیکٹ احتیاط سے ڈفیوز کر دو۔"[۱۷]

اس ناول کے اہم کردار جمال کالی پہاڑی پر کافی عرصہ رہنے کے بعد شہر آیا تھا۔ اور وہاں کے لوگوں کو اکثر یاد کرتا تھا اور انھیں سچا اور اچھا سمجھتا تھا۔ کالی پہاڑی ایک سماج ہے۔ کالی پہاڑی کیا ہے؟ کوئی خواب کی جگہ ہے ایسی کون سی جگہ ہے جہاں وقت رک ہوا ہے گھڑی کی سوئیاں گیارہ بج کر سات منٹ ہی دکھاتی ہے کیوں آگے نہیں بڑھتی ہے۔ کالی پہاڑی کیا ایک خیال ہے ؟ اگر خیال ہے تو کس حوالے یہ خیال سماج کی طرف اشارہ ہے۔؟ اور یہ سب ہمیں جمال کردار کی بدولت پتا چلتا ہے۔

"جمال اسٹڈی میں بیٹھا کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ پھر ایک انگریزی رسالہ اُٹھایا جو سہ ماہی چھپتا تھا۔ چند صفحے پلٹنے کے بعد اس کی نظر ایک وسیع تصویر پر پڑی، جو رسالے کے دو چکنے صفحات پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ایک پہاڑی کی تصویر تھی جس میں ایک حویلی کا ہیولا تھا۔ نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ تحریر کا عنوان تھا" پراسرار پہاڑی' جمال کے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ عنوان کے نیچے ایک مشہور مغربی تجزیہ نگار کا نام تھا جو تفتیشی صحافت میں ممتاز مقام رکھتا تھا۔ اپنے اختصار اور توازن کے باعث بھی مشہور تھا، صحافیوں میں عموماً جن کا فقدان ہوتا ہے۔ جمال پھٹی ہوئی آنکھوں سے تحریر میں گم ہو گیا۔"[۱۸]

کالی پہاڑی پہ تخریب کاری کا سامان تیار کیا جاتا ہے۔ وہاں کے لوگ شہر کے کیوں دشمن ہیں ؟ وہ شہر کو کیوں بدبودار کہتے ہیں۔ یہ لوگ پہلے اسی شہر کے باسی تھے پھر یہاں کی ریاستی حکمران سے تنگ آکر پہاڑوں میں آ چھپے ہیں اور یہاں سے جمال کو ایک میگزین پڑھتے ہوئے معلوم ہوا کہ میں یہاں رہ کر آیا ہوں ۔ جمال بہت پریشان تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ پریشانی اس وجہ سے بڑھ گئی کہ میگزین میں کالی پہاڑی پر مضمون لکھنے والا شخص ایک تفتیشی صحافت میں مہارت رکھتا تھا۔ جمال کو سب کچھ سمجھ آنے لگا۔ ناول نگار نے جو کالی پہاڑی کی تصویر کشی کی ہے کچھ یوں ہے:

> "پہاڑی کے گرد سو مربع کلومیٹر کا علاقہ سیل کر دیا گیا تھا۔ پہاڑی کے اُوپر ایک پرانی حویلی کے کھنڈرات تھے یوں لگتا تھا جیسے اس پر بمباری کی گئی ہے۔ تین ماہ پہلے یہاں تین خود کش حملہ آوروں نے دھماکہ کر کے پچپن غیر ملکی باشندوں کو اُڑا دیا تھا۔ صدیوں سے یہ علاقہ ایک سلطان کے خاندان کی سلطنت تھی۔ قریب دس سال پہلے بین الاقوامی سودے کے تحت ایک کنسور شیم نے یہ علاقہ اونے پونے داموں خرید کر سلطان کو یورپ اور رعایا کو اِدھر اُدھر بھیج دیا۔ رعایا کوئی چار سو لوگوں پر مشتمل تھی۔"[۱۹]

جمال اس ٹیم کے ساتھ کالی پہاڑی پر جاتا ہے تو وہاں کا ماحول دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔ پہاڑی کے گرد والا علاقہ سیل کر دیا گیا تھا۔ جمال کو پھر مندری والا کی وہ حویلی بھی نظر آ گئی جہاں وہ کافی عرصہ مندری والا کے ساتھ رہا جو اب کھنڈر بن چکی تھی اور اس پر ڈارون حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا گیا تھا۔ تفتیشی افسر نے بتایا کہ یہاں تین ماہ پہلے تین خود کش حملہ آوروں نے غیر ملکی باشندوں کو دھماکہ کر کے مار دیا تھا۔ یہ علاقہ ایک سلطان کے پاس ہوتا تھا۔ بعد میں اسے کنسور شیم نے یہ علاقہ خرید لیا تھا اور یہاں کی رعایا کو یورپ اور دوسرے شہروں اور ملکوں میں بھیج دیا تھا۔ جمال یہ کچھ سن کر سکتے میں آ گیا:

> "ہمارا ملک حضرت سلیمان کے عصا کی طرح کھوکھلا ہو رہا ہے۔ چوب ریشوں میں دو قسم کی دیمک رینگتی اور پرورش کرتی ہے۔ ملکی اور غیر ملکی دونوں قسموں میں ہم زیستی کا رشتہ ہے۔ ہمارے قومی ادارے صحرائی مزار کے کیکر پر بندھے پارچوں کی طرح ہیں۔ پہلے جن کا رنگ اُڑا اور اب دھجیاں بکھر رہی ہیں۔ ہمارے ملک کی سرحدوں میں ریت ہے۔ بنیادوں کے پاؤں اُکھڑتے ہیں۔ ملکی سیاست دُور افتادہ اور غریب گاؤں کے امیر جاگیر دار وڈیرے کی بیٹھک ہے۔ جہاں کارندوں کے ذریعے غریبوں سے لوٹا گیا سرمایہ اور بینوں سے بھیک لیا گیا قرضہ طوائفوں کے سر پر اُڑایا جاتا ہے۔ ہمارے جمہوری معمار غیر پیشہ اور بے ہنر ہیں۔ کئی عشروں سے تخریبی تعمیرات میں مصروف ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں کجی ہے۔ عمارت کی بنیاد ٹیڑھی رکھتے ہیں۔ مسالا ناقص لگاتے ہیں۔ ذرا آندھی چلے تو کھڑکیاں اور دروازے چوکھٹ چھوڑتے ہیں۔ ہلکی بارش ہو تو بھی چھت ٹپکنے لگتی ہے جن معماروں کو واجبی ہنر آتا ہے وہ عمارت کو فالٹ لائن پر بنا کر زلزلے کا انتظار کرتے ہیں یا دریا کنارے دیوار اُٹھا کر سیلاب کا۔ سیاست دان اور فوجی میوزیکل چیئر کا کھیل کھیلتے ہیں۔ ہٹ دھرمی کا یہ عالم ہے

کہ اس کھیل کے دوران عوام کو داد طلب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ صدور اور وزرائے اعظم قرآن اور حدیث سے فال نکالتے ہیں۔ عوامی خطاب سے پہلے اُن آیات کو منتخب کرتے ہیں جو ان کے عہدوں کی طوالت پر خدائی مہر ثبت کریں۔ یہاں اتنا گھناؤ مذہبی کھیل کھیلا جارہا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے وزرائے اعظم درآمد کرنا پڑتے ہیں۔ حالانکہ یہ اتنا بڑا ملک ہے کہ جس کے بڑے شہروں کی آبادی دُنیا کے کئی چھوٹے ممالک سے زیادہ ہے۔"[20]

ملک کے حالات پر جمال اپنی رائے دیتا ہے کہ ملک کو نظام دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے حکمران اپنی عوام کے حالات سے بے خبر ہے اور مقتدر طبقات اپنے مفادات کی خاطر اپنے اصولوں سے غافل ہیں۔ ایسے حالات میں ملک المناک حادثوں اور سانحوں کا سامنا کرتا رہے گا۔ ملک میں خودکش حملے، دہشت گردی، بجلی گیس، غربت، معاشی، اخلاقی، بے روزگاری، تعلیم کا فقدان، بدعنوانی اور صحت کے حوالے سے مسائل درپیش ہیں۔ عبداللہ حسین نے سرسری طور پر نچلے اور بڑے طبقے کے حوالے سے تذکرہ معنی خیز تذکرہ کیا ہے:

"نچلے طبقے کے چند لوگ ابھی تک شور مچا کر روانہ ہوتی ہوئی موٹر کاروں کو دیکھنے کے لیے باہر کھڑے تھے۔"[21]

نچلے طبقے کے لیے یہ موٹریں کاریں، مختلف گاڑیاں ایک عجوبۂ روزگار ہوتی تھیں۔ ہر وہ چیز جو انھیں حاصل نہ ہوتی اسے دیکھنے کے لیے چھوٹا طبقہ کھڑا ہوتا تھا۔ یہ منظر اس طبقے کی محرومی اور یاس کی عکاس ہے۔ زندگی کی بنیادی اور اہم ضروریات سے یہ معاشرہ یہ حکمران اپنی رعایا چھوٹے طبقے کو محروم رکھا جاتا ہے۔

ii۔ تہذیب و تمدن، اقتصادیات اور ماحولیات پر مکالمے:

کالی پہاڑی پر ایک کارخانہ جس میں ہر طرح کی چیزیں میسر ہوتی ہیں۔ ناول نگار نے اپنے کردار جمال کے ذریعے اپنے قاری کو بتایا ہے:

"صبح کے وقت جمال عمارت میں اِدھر اُدھر گھوم پھر رہا تھا۔ ایک کمرے میں داخل ہوا۔ جڑی بوٹیوں کی سفوفی مہک نے استقبال کیا۔ شیشے کی الماریوں، میزوں اور ریکس میں انواع واقسام کی جڑی بوٹیاں اور جانوروں کی حنوط شدہ لاشیں پڑی تھیں۔"[22]

کالی پہاڑی پر آنے کے بعد جمال گھومتا رہتا ہے۔ وہ ایک اسی جگہ جاتا ہے جہاں ایک بڑا کارخانہ لگا ہوتا ہے۔ جس میں انسانی ضروریات کی ہر شے وہاں تیار ہوتی ہے۔یعنی یہ اس سماج کے لوگ اپنے لیے خود چیزیں تیار کرتے ہیں۔ جیسے کہ جڑی بوٹیوں سے ادویات تیار کی جاتی ہیں۔ ان کو محفوظ کرنے کے لیے باقاعدہ الماریاں اور ریکس کا بندوبست بھی کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جمال نے وہاں دیکھا کہ جانوروں کی حنوط لاشیں بھی پڑی ہوئی ہیں۔

محنت کش اور مزدور کسی بھی ملک کی معاشی ترقی اور خوشحالی کے لیے سرگرم رہتے ہیں۔ اس لیے یہ ایک ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ یہ لوگ معاشرے کی بنیادی اکائی اور لازمی جز قرار دیے جاتے ہیں۔ کوئی بھی موسم ہو بارش ہو آندھی ہو یا برف کا موسم ہو محنت مشقت کرنے والے مزدوری کے لیے آتے ہیں۔ یعنی خار کانوں میں کام کرنے والے اس معاشرے کے لیے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ناول نگار نے اس اہمیت کو اس ناول میں بھی کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

> ”ذرا دن چڑھا تو بہت سے لوگ کارخانے میں آنے لگے۔ عورتیں، مرد اور بچے مختلف کمروں میں کام کرنے لگے۔ مطب میں دوائیاں تیار ہونے لگیں۔ اس کے ملحقہ کشید خانے میں بڑے بڑے لوہے اور پیتل کے ظروف اور دھوپ دان۔ نیچے جلتی ہوئی آگ سے تپنے لگے۔ سوراخ دار ڈھنکوں سے دُھواں اٹھنے لگا۔ خوشبو اور نم سے بھرا ہوا۔ آمیز گروں کے آہنی دستوں پر ہاتھ اُوپر نیچے چلتے لگے۔ ٹونیٹوں کے آگے شیشے کے بیکر رکھے گئے تاکہ قطرہ قطرہ کشید جمع کی جاسکے۔“[۲۳]

جمال کارخانے میں ہی تھا جب لوگ آتے جارہے تھے۔ کارخانے میں کام کرنے والوں میں مرد عورتیں اور بچے شامل تھے اور وہ الگ الگ کمروں مختلف نوعیت کے کام کرنے میں مصروف تھے۔ ایک کمرے میں طب کا کام ہوتا تھا۔ یعنی وہ ادویات تیار کی جاتی تھیں۔ ساتھ والے کمرے میں برتن تیار کیے جاتے تھے۔ یعنی زندگی کی ہر ضروری چیز اس کارخانے میں بن رہی تھی۔ کارخانے کے حوالے سے ناول نگار نے جمال سے کس طرح بیان کروایا ہے۔ دنیا کی ہر چیز اس کارخانے میں تیار ہوتی تھی جسے دیکھ جمال دنگ رہ جاتا تھا۔ آخر یہ کالی پہاڑی کیا ہے۔ یہاں یہ لوگ کہاں سے آبسے ہیں۔ اور ایک اپنا الگ سماج بنالیا ہے:

"ایک بڑے کمرے میں مختلف اوزار بنائے جارہے تھے۔ بنائے کیا جارہے تھے، گھڑے جارہے تھے۔ اب یہ کوئی اسٹیل مل تو تھی نہیں جہاں خام لوہا پگھلا کر سانچوں میں ڈالا جاتا۔ لوگ کالی پہاڑی کے مختلف گھروں سے لوہے کے ٹکڑے اور چھیلن، ایلومنیم کے ریزے اور کترن اور پیتل کے ٹکڑے جمع کر کے یہاں لے آتے پھر برابر کرتے اور باڑھ نکالتے تھے۔ نہانیاں، کدالیں، کھرپے، پھاوڑے، بیلچے، کسیاں۔ ہتھوڑیاں، آرے، کروتیں اور دیگر آلات بنائے جاتے۔ اصل میں ان اوزاروں کے پھل بنائے جاتے تھے۔ البتہ ان کے دستے جنگل کی نئی لکڑی سے تراشتے جاتے۔"[۴۴]

تکنیکی مہارت اپنے معاشرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک معیاری کام جس سے سارے معاشرے کو فائدہ وہی کام بہتر ثابت ہوتا ہے۔ ٹیکسٹائل ایک ملک کے لیے ہی نہیں بلکہ دوسرے ملک کے لیے فائدمند ہے۔ صنعت، جدت طرازی اور معیاری کام زندگی کا اہم جزو ہے۔ ناول نگار نے ایک پہاڑی پر ایک دنیا بسا کر دکھائی۔ ناول میں زندگی سے بھرپور کرداروں کو اکٹھا کیا اور ان کے ساتھ رہ کر معاشرے میں رونما ہونے والے معاملات کی طرف اشارہ کیا اور ان ضروریات کے بارے میں بھی اپنے کردار سے بیان کروایا ہے۔ سماجی اور معاشی زندگی کا اہم کردار جولاہا ہوتا تھا۔ جیسے ہر شہر، گاؤں میں موچی، تیلی، کمہار اور نائی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی طرح جولاہا بھی ہوتا تھا جو ایک کمرے میں گڑھا کر کے کھڈی لگاتا تھا جس پر کھیس، کھدر اور دریاں، تولیے بُنتا تھا۔ پرانے دور میں گاؤں والے جس کھدر کو استعمال میں لاتے تھے وہ ان کے اپنے کھیتوں کی کپاس سے بُنا ہوتا تھا۔ جولاہوں کے گھروں میں کھڈی کی کھٹ کھٹ کی آواز آتی رہتی تھی۔ جولاہوں کا مخصوص گاؤں بھی ہوتے تھے۔ جہاں یہ دریاں، کھدر اور کھیس بُنتے اور پرانے قصے ایک دوسرے کو سناتے رہتے۔ کپڑا تیار کر کے جولاہے قریہ قریہ، گاؤں گاؤں۔ شہر شہر گھومتے تھے۔ یہ لوگ مختلف قسم کے دھاگوں کے ساتھ رنگ دار دھاگے ملا کر ہاتھ کی کھڈی پر کپڑا بُنتے تھے۔ ریشم، ململ وغیرہ کپڑے کو بہت خوب صورت بنادیتے تھے۔ ناول نگار نے بھی کالی پہاڑی پر موجود ایک ٹیکسٹائل، کپڑوں کی فیکٹری کے بارے میں جمال کے ذریعے سے بیان کیا ہے:

"ایک بڑا ہال ٹیکسٹائل مِل تھا۔ سوت اور ریشم ہیلی کاپٹر سے آتا اور یہاں لگی ہوئی کھڈیوں پر بُنا جاتا۔ تانے بانے میں چابک دستی سے پوریں چلتیں۔ چادریں کھیس۔ کفن، نمدے،

چٹائیاں، قالین طرح طرح کے پارچے بنتے۔ چند درزی ہاتھوں سے سوزن کاری کرتے تھے۔"[۲۵]

جمال کے ذریعے یہ پتا چلا کہ کالی پہاڑی پر ایک بڑے کارخانے کے اندر ایک کمرے میں کپڑا تیار کیا جاتا تھا۔ اس کے لیے جو لوازمات ضرورت پڑتے جن میں سوت اور ریشم قابل ذکر ہیں انھیں شہر سے لایا جاتا اور اس کارخانے میں جولاہوں کی طرح لگی ہوئی کھڈیوں پر کپڑوں کو بُنا جاتا جن میں کھیس، چادریں، قالین اور دوسری ضروری چیزیں بنائی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہاں درزی پھٹے کپڑوں پر پیوند کاری بھی کرتے تھے۔ کالی پہاڑی ایک مکمل معاشرہ لگتا تھا۔ اور معاشی نظام بھی منظم طریقے سے چل رہا تھا۔

اقتصادی بحران کے دنوں میں جب زیادہ تر فیکٹریاں اپنی کل پیداواری صلاحیت کا صرف پچاس فیصد پیداوار دے رہی ہوتی ہیں۔ زراعت پر مبنی صنعتیں پوری صلاحیت کے مطابق کام کرتی ہیں اور اپنی برآمدات کے ذریعے ملک کو وہ غیر ملکی زرمبادلہ فراہم کرتی ہیں اور یہ عمل کسی بھی ملک کی معیشت کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔

صنعتی انقلاب کی بات کریں تو انگلینڈ صنعتی انقلاب کا مرکز تھا۔ اس اقدام میں جن کا ہاتھ رہا ہے اُن میں شامل جیمس ہارگریوز، رچرڈ آرک رائٹ اور سیموئیل کرامپٹن کی پارچہ کی مشینری کی ایجادات ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تھامس نیوکم، رچرڈ وائٹ اور جارج سٹیفن سن کے بھاپ کے انجنوں کی ایجاد نے صنعت کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انگلینڈ نے کوئلہ، کپڑا اور لوہا بنانے میں اہم مقام حاصل کیا۔ صنعتی حوالے سے معاشی تنظیم کس طرح سے کام کرتی رہی اس سلسلے میں ول ڈیورانٹ لکھتے ہیں:

"تجارت نے غیر متمدن دنیا کو درہم برہم کر کے رکھ دیا کیونکہ اس کے شروع ہونے سے دولت اور منافع کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے ملکیت کا تصور نہیں تھا لہٰذا حکومت بھی نہیں تھی۔ معاشی ارتقا کے ابتدائی مراحل میں ملکیت زیادہ تر ذاتی استعمال کی اشیا تک محدود تھی۔ ایسی اشیاء (جن میں بیوی بھی شامل ہے) کے ساتھ ملکیت کا ایسا تصور وابستہ تھا کہ انہیں اس کے مالک کے ساتھ ہی دفن کر دیا جاتا تھا۔ اس کا اطلاق ایسی چیزوں پر بہت کم ہوتا تھا جو ذاتی استعمال میں نہیں تھیں۔ ان کے معاملے میں ملکیت کا تصور مسلسل تعلیم کا متقاضی تھا۔ غیر متمدن لوگوں میں تقریباً ہر طرف زمین کمیونٹی کی ملکیت ہوتی تھی۔ شمالی

امریکی انڈینیز، پیرو کے باشندے، انڈیا (بنگلہ دیش کے چٹاگانگ) پہاڑی قبیلے اہل بورینا اور جنوبی سمندری جزیروں کے باسی مشترکہ طور پر زمین کی ملکیت رکھتے، اسے کاشت کرتے اور اس کی فصل میں مل کر شریک ہوتے تھے۔ اوماہا انڈینیز کہتے تھے زمین پانی اور ہوا کی طرح ہے جو فروخت نہیں کی جاسکتی۔ سفید فاموں کی آمد سے قبل سموا میں زمین بیچنے کا تصور ناپید تھا۔ پروفیسر ریورز نے میلینیا اور پولی نیا میں زمین کی اشتراکیت دیکھی اور اندرونی لیبریا میں یہ آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔"[۲۶]

ایک طرف سرمایہ داری کا دور ہے اور دوسری طرف کمیونزم اور سوشلزم کی یلغار جاری ہے۔ تیسری جانب دنیا میں مختلف ممالک ترقی پذیر اور کچھ پسماندہ ممالک سامنے آرہے ہیں۔ اقتصادی ذرائع کی اگر ملک میں مضبوط نہیں ہو گی تو وہ ملک کبھی بھی دنیا میں اپنا مقام حاصل نہیں کرسکتا یعنی دنیا میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اقتصادی طور پر مضبوطی معاشرے خوشحالی کی ضمانت ہے۔ اگر کسی بھی ملک کا اقتصادی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہے گا تو پسماندگی اُس ملک کا مقدر بن جاتا ہے۔

جیسے کسی بھی فیکٹری یا کارخانے میں باقاعدہ دفتری کام بھی ہوتا ہے یعنی کام کرنے والوں کا مکمل ڈیٹا بھی رکھا جاتا ہے۔ اس کے لیے بھی مختلف لوگ تعینات کیے جاتے ہیں۔ کام کرنے والوں کے لیے تنخواہ بنانے والے علیحٰدہ ہوتے ہیں اور باقی چیزوں کا حساب کتاب رکھنے والے الگ لوگ ہوتے ہیں۔ اور ایک منظم طریقے سے کارخانہ چلایا جاتا ہے۔ ناول نگار نے اس حوالے سے وہاں کی منفرد تصویر کھینچی ہے۔ جمال جو کہ اس ناول کا اہم کردار ہے مرکزی کردار ہے۔ وہ سوچتا ہے:

"جمال نے سوچا کہ ہر سکشن کا ایک فورمین ضرور ہو گا۔ یا ورک منیجر، جو مصنوعات کی کوالٹی کو کنٹرول کرنے کے علاوہ اکانومی آف سکیل کا بھی خیال رکھتا ہو گا۔ ایک اکاؤنٹنٹ بھی ہو گا ہر کمرے میں۔ جو کاسٹ اکاؤنٹنگ کا ماہر ہو گا۔ مگر یہ انتظام کیا خاک ہو گا جب ایک پرندے کے پاؤں میں سونے اور ہیرے کی پائل ہے۔ لوگ اپنی مرضی سے کام کر رہے ہیں۔ کبھی کام کرتے ہیں تو کبھی باہر جا کر ٹہلنے لگتے ہیں۔ کچھ لوگ باہر جا کر واپس ہی نہیں آتے۔"[۲۷]

اعلیٰ طبقوں کی اپنی الگ تہذیب ہوتی ہے۔ تاجروں اور جاگیر داروں اور سیاسی حکمرانوں کے لیے کوئی اصول معنی نہیں رکھتے۔ کسی بھی فرم میں کام کرنے والوں کو چھوٹا طبقہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ اپنے مفادات کی خاطر کوئی منظم نظام نہیں لایا جاتا ہے۔

معاشرے میں ایسی چیزیں بہتات میں پائی جاتی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ اس معاشرے کے حکمران صنعتی سرمایہ دارانہ نظام کی حیثیت سے، سیاست دان کے حیثیت سے صرف دولت کمانا اور دولت کے ذریعے اقتدار حاصل کر کے کمزور لوگوں پر راج کرنا ہمارے معاشرے کا مزاج ہے:

"میں جھوٹ کیوں بولتا ہوں؟ جانتے بوجھتے ہوئے جھوٹ بولتا ہوں۔ دانستہ منافقت کرتا ہوں۔ کیا جھوٹ اور منافقت میرے خون میں شامل ہے؟ کالی پہاڑی کے لوگ کیوں جھوٹ نہیں بولتے تھے؟ رنگ رنگ کے لوگ تھے مگر سب کا رویہ ایک جیسا تھا۔ صاف ستھرا، دُھلا، دُھلا، اُجلا اور چمکیلا۔ میں کیوں ان لرن نہ کر سکا۔ کیوں اپنا میل نہ دھو سکا؟ جب میں جانتا ہوں کہ جھوٹ بول رہا ہوں تو کیوں بولتا ہوں؟ زندگی آسان کرنے کے لیے؟ دولت شہرت اور عزت کے لیے؟ اگر میں جلسے میں بلند بانگ دعوے نہ کرتا تو کیا ہو جاتا؟ جلسہ تو ہر صورت میں کامیاب ہونا ہی تھا کیونکہ پیسہ بہت لگا تھا۔ کیا جھوٹ اور منافقت ہمارے سماج اور معاشرت کی گھٹی میں ہے؟ کیا میں اس سماج کا حصہ ہونے کی وجہ سے جھوٹ بولتا ہوں؟ کیا جھوٹ میرے لاشعور میں بیٹھا ہوا ہے؟ بالفرض میں جھوٹ نہ بولوں تو کیا ہو گا؟ کچھ بھی نہیں۔۔۔کچھ بھی نہیں ہو گا۔ کیا بچپن سے جھوٹ اور منافقت غیر محسوس طریقے سے شخصیت کا حصہ بنتی ہے؟ تو قصور میری تربیت کا ہوا۔ میرے ماحول کا ہوا۔ میری آب و ہوا کا ہوا۔ کیا لوگوں کو احساس نہیں ہوتا کہ وہ بچوں کے سامنے جھوٹ بول کر جھوٹ کو دوام بخش رہے ہیں اور جھوٹ ایک نسل سے دوسری میں منتقل ہو رہا ہے؟ اور اس پر طرہ یہ کہ ہم جھوٹ بولنے کے خلاف تقریریں بھی کرتے ہیں۔ سونے سے پہلے اسے اپنے بچپن کے واقعات یاد آئے۔ گزرے ہوئے واقعات فلم کی طرح چلنا شروع ہوئے تو اسے احساس ہوا کہ جھوٹ اور منافقت غیر محسوس انداز میں بچے کی تربیت کا حصہ بنتی ہے اور اس کی شخصیت کے خدوخال بناتی ہے۔"[۲۸]

جمال کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ غلط راستے پر چل نکلا ہے۔ کالی پہاڑی کے لوگ جھوٹ نہیں بولتے وہ اپنی زندگی اچھی گزار رہے ہیں۔ وہاں کے لوگ ایک جیسے ہیں ان میں منافقت نہیں ہے۔ جمال کو اچھی طرح سے احساس ہو گیا تھا کہ اس نے سیاست کے حوالے سے الیکشن میں کتنا جھوٹ بولا اور ان روپوں کی خاطر ایک پارٹی کو چھوڑ کر دوسری میں شامل ہوا۔ جمال بہت زیادہ شرمندہ تھا۔ اسے سمجھ آگئی تھی کہ سماج کی بہتری کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

ناول میں دہشت گردی کے حوالے سے ناول نگار نے اپنے کرداروں کے ذریعے سے اس سماج کی تصویر کھینچی ہے۔ جیسے جمال سے ایک غیر ملکی کچھ یوں بات کرتا ہے:

"دہشت گردوں کے بہت سے اڈے تباہ ہو گئے ہیں۔ مگر پھر بھی بہت کام کرنا باقی ہے جمال!"

"ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"کالی پہاڑی ان میں سے ایک ہے جمال۔"

یہ بات سنتے ہی جمال کے گلے میں مئے ناب کا گھونٹ رک گیا اور اسے کھانسی کا دورہ بڑا۔ مکین اسے غور سے دیکھتے ہوئے اُٹھا۔ ایک اور جام بھرا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"کالی پہاڑی ان میں سے ایک ہے جمال!"[۲۹]

جمال سے مکین نے کہا کہ دہشت گردوں کے بہت سے اڈے تباہ ہوئے ہیں۔ لیکن ابھی ہم نے اسے جڑ سے اکھاڑ کے پھینکنا ہے۔ جمال نے مکین کی ہاں میں ہاں ملائی۔ جمال اچانک چونک اٹھا جب مکین نے کہا کہ دہشت گردوں کے اڈے میں شامل کالی پہاڑی بھی شامل ہے۔ جمال پہاڑی کا نام سنتے ہی سکتے میں آ گیا۔ کیونکہ جمال کالی پہاڑی میں بہت زیادہ رہا ہے۔ ان لوگوں کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن وہ جگہ کیسے دہشت گردوں کی ہو سکتی ہے۔ جمال اسی لیے بہت پریشان ہو گیا تھا۔

iii۔ ماحولیات کی جزئیات نگاری:

زمین، پانی، فضا، ہوا کو ماحول کہتے ہیں۔ ان میں طبعیاتی، حیاتیاتی اور کیمیائی اجزا اور عناصر شامل ہوتے ہیں۔ اس دُنیا میں جو کچھ ہے وہ ماحول میں آتا ہے۔ یہ آب وہوا ابتدا سے انسانوں کا ساتھ دے رہی ہے اور انسان بھی اس سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ناول نگار وحید احمد لکھتے ہیں:

> ''سورج تیزی سے غروب ہو رہا تھا۔ مہین بادلوں نے روشنی کا راستہ چھوڑ دیا تھا۔ آدھا سورج پہاڑ کے پیچھے تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی پہاڑ کی چوٹی سے نارنجی چھتری تانے عقبی وادی میں اُتر رہا ہے۔ جب وہ ٹریک سے اُتر کر کھلے گھاس پر چلنے لگے تو جمال نے دیکھا کہ کُٹیا کا دروازہ کُھلا ہے اور چراغ کی روشنی چھن رہی ہے۔''[۳۰]

ناول نگار نے اس ناول میں ماحول کی جزئیات نگاری بھی کی ہے۔ موسم کی تبدیلی کی وجہ سے ایک ملک کے پرندے دوسرے ملک کی طرف ہجرت کرتے ہیں۔ روس کے علاقے سائبیریا میں موسم بہت سرد رہتا ہے۔ درجہ حرارت منفی پچاس سینٹی ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ وہاں کے طلبہ ٹھٹھرتے ہوتے سکول جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگ گھروں میں محصور ہو کے رہ جاتے ہیں۔ سخت سردی کی وجہ سے وہاں کے پرندے بھی مختلف ممالک کا رخ کرتے ہیں۔ زیادہ تر پرندے ایشا کی طرف ہجرت کرتے ہیں۔

> ''سائبیریا میں برف بڑھنے لگی۔ غذا گھٹنے لگی۔ پرندوں کو دانہ دنکا ملنا دشوار ہوا۔ خمیری روٹیوں کے ٹکڑے بھی میسر نہ سکے تو غذا کی قلت خمیری رطوبت بن کر پروں کے نیچے خون میں ناچنے لگی۔ اُڑان کی خواہش سے پر پھولنے لگے۔ یہ سفر کا پیغام تھا۔ ہجرت، ترکِ وطن اور نقل مکانی کا اِشارہ۔ جواب میں کالی پہاڑی کے پرندوں کے پر ہوا سے پھول گئے۔ دیسی پرندوں کو احساس ہو گیا کہ بدیسی پرندے لمبی اُڑان کھینچ کر ان کے پاس آنے والے ہیں۔ بھاری برف سے ہلکی برف کی جانب۔ سائبیریا سے پرندے آرہے ہیں۔ فضا میں ڈاروں کے مختلف نمونے بناتے ہوئے۔''[۳۱]

سائبیریا روس کا ایسا علاقہ ہے جہاں موسم بہت ٹھنڈا رہتا ہے اور اس موسم میں غذائیت کی کمی بھی ہو جاتی ہے۔ پرندوں کے لیے اپنی خوراک اکٹھا کرنا بہت زیادہ دشوار ہو جاتا ہے۔ روٹیوں کے ٹکڑے بھی سردی کی وجہ

سے سخت ہو جاتے ہیں اور یہ روٹی پرندوں کے لیے کسی کام کی نہیں ہوتی ہیں۔اس لیے پرندے ایسے علاقے سے کسی دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت کرتے ہیں جہاں کا موسم پرندوں کے لیے بہت ساز گار ہوتے ہیں۔سائبیریا کے پرندے جب کالی پہاڑی کی طرف ہجرت کر کے آئے تو انھیں کچھ نیا سا احساس ہوا کیونکہ یہاں کا موسم سائبیریا کے موسم سے بہت مختلف تھا۔سائبیریا کے پرندے کالی پہاڑی پر اڑتے ہوئے ہوا میں دباؤ محسوس کرنے لگے تھے اور یہ احساس کالی پہاڑی کے پرندوں نے بھی محسوس کیا تھا۔

سائنس دانوں کا یہ کہنا ہے کہ پرندوں کے قطار سے بہت رہنمائی ملتی ہے۔اُن کا بھی یہ کہنا ہے کہ پرندے انگریزی حرف وی (v) کی شکل میں اڑتے کیوں ہیں اس کی تحقیق کرنے پر یہ بات سامنے آئی ہے کہ پرندے اڑتے ہوئے پہلے خود سے اڑنے والے پرندے کو دیکھتے ہیں اور اگلے پرندے کے پروں سے حاصل ہونے والا اُبھار کی پیروی کرتے ہیں اور فائدہ اُٹھاتے ہیں:

> ''دُنیا بھر کے پرندے آپس میں ایک لاسلکی تعلق رکھتے ہیں۔ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔اٹیم کے مداروں میں گھومتے الیکٹرانوں کی طرح۔ایک الیکٹران کالی پہاڑی میں تو دوسرا سائبیریا میں۔زاغ کالی پہاڑی میں زغن سائبیریا میں۔کالی پہاڑی کی چڑیا، بلبل، کوئل، کوّا، رنگین ماہی خور، نیل کنٹھ اور مرغ زرّیں جانتا ہے کہ سائبیریا کی نیلی فاختہ، سلیٹی کبوتر، لم ڈھینگ، کونج، مرغابی، سارس، چیل، گدھ اور شکرا کس حال میں ہے۔انھیں یہ بھی علم ہے کہ جب درختوں کے پتے رنگین ہو کر گرنے لگیں تو یہ بدیسی پرندے آتے ہیں اور برف کے بعد جب کونپلیں پھوٹنے لگیں تو یہ پردیسی واپس اپنے دیس کی طرف اُڑ جاتے ہیں۔افزائشِ نسل کے لیے۔پھر اگلی رُت آتی ہے۔نئے پرندے لمبی اُڑان بھرتے ہیں۔سفر کے ستارے اور آزمودہ کار پرندوں کے پیچھے ڈاروں کے نمونے بناتے ہوئے۔''[۳۲]

دُنیا میں پرندے آپس میں گہرا تعلق رکھتے ہیں۔جب اڑتے ہیں کو ایک قطار کی صورت میں یعنی ایک دوسرے سے جڑتے ہوتے ہیں اور مل کر کام کرتے ہیں۔جس طرح اٹیم کے مدار میں الیکٹران گردش کرتے ہیں۔ناول نگار وحید احمد نے پرندوں کی ہجرت کے بارے میں اور ان کے نقل وحمل کے بارے میں لکھا۔کالی پہاڑی پر سائبیریا سے آنے والے پرندوں کے پیچھے موسم کی تبدیلی ہے۔کالی پہاڑی پر آنے والے پرندوں میں بلبل، کوئیل، کوا، کبوتر، مرغابی

،سارس، چیل، گدھ وغیرہ موسم کی سخت کی وجہ سے پہاڑی پر آئے۔ سردی کے موسم میں افرائشِ نسل میں دقت پیش آتی ہے کیونکہ خوراک کی کمی ایسے علاقوں میں ہوتی ہے۔ اس لیے پرندوں جھنڈ کی صورت میں دوسرے ملک چلے جاتے ہیں اور اپنی نسل کو بڑھاتے ہیں۔ جس طرح تہذیب میں لوگ مل کر ایک معاشرہ بناتے ہیں۔ اسی طرح پرندے بھی ایک دوسرے کے ساتھ تعلق بناتے ہیں۔

iv۔ سیاسی اور معاشی نظام:

سیاسی نظام نے انسانی زندگی کا نظام ایک ریاست میں متعارف کرایا۔ سیاسیات میں اخلاقیات کے علاوہ تاریخ اور دیگر علوم ہوتے ہیں۔ یہ بات مسلم ہے کہ انسان کا معاشرتی اداروں سے تعلق سے سیاسی نظام کے باعث ہے۔ معاشرے میں مختلف لوگوں کا طرزِ عمل ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ سیاسی فلسفی مختلف نظریوں، دلیلوں اور مختلف موضوعات کے ذریعے بحث کرتے ہیں۔ اس نظام کے کئی پہلو ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

کوئی بھی معاشرہ ایسے حالات کا تقاضا ضرور کرتا ہے جس میں ریاستی، اور حکمرانی نظام اپنے اندر سماجی، سیاسی، اخلاقی اور معاشی تضادات رکھتا ہو۔ حکومتی نظام میں اگر تقسیم کا عمل جاری رہے تو معاشرہ انتشار کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ دوسری طرف کچھ طاقت ور طبقہ اپنی ہٹ دھرمی سے ملک میں مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے عوام اپنے ہی ملک میں محفوظ نہیں رہ پاتی اور زندگی کے دوسرے معاملات بھی ٹھیک نہیں ہو پاتے۔ معاشرتی، معاشی، تعلیمی اور دوسرے ثقافتی عناصر برباد ہو جاتے ہیں۔ ناول نگار نے اس ناول میں سیاسی نظام کی طرف اپنے کرداروں کی مدد سے اس طرف اشارہ کیا ہے:

> ”حکومت کی بو ہوتی ہے۔ جو پھیلتی ہے اور آتی ہے۔ مشامِ جاں میں سوئیوں کی طرح چھبتی ہے۔ شریانیں اُدھیڑتی ہے۔ نسیں پھاڑتی ہے۔ سوچ مفلوج کرتی ہے۔ ضمیر کا گلا گھونٹتی ہے۔ قویٰ مضمحل کرتی ہے۔ حکومت مردار جسم کی طرح ملک کے تمام شہروں، گاؤں، قصبوں، کھلیانوں، صحراؤں، پہاڑوں، ندیوں، دریاؤں اور سمندر میں پڑی ہوتی ہے۔ کٹی کھوپڑی اور پھٹے پیٹ کے ساتھ۔ جس کی انتڑیوں میں گدھ چونچوں اور پنجوں کے نشتر چبھو کر مرا ہوا فضلہ ہوا میں اُچھالتے ہیں۔ حکومت کی بُو ہوتی ہے۔ جو آتی ہے۔ کھانے نہیں دیتی۔ جینے نہیں دیتی۔“[۳۳]

حکومتی نظام کبھی بھی اپنی بنیادوں کو مضبوط نہیں کرپاتا جب تک اس میں سماجی، سیاسی، جمہوری، انتظامی اور آئینی معاملات موثر نہیں ہوپاتے۔ عوام کا ریاست اور حکومت کے درمیان خراب حالات بتدریج بڑھتے رہیں تو بداعتمادی کی فضا پیدا ہونے لگتی ہے۔ ایسے حالات میں حکومت سے بو ہی آتی ہے یعنی حکومت اپنی عوام کا خیال نہیں رکھ پاتی معاشرہ چل نہیں پاتا اور لوگوں کی نسلیں برباد ہو جاتی ہیں۔ تعلیمی نظام، معاشی نظام خراب ہونے کی وجہ سے لوگوں کی زندگیوں کی کھوپڑیاں جو سوچنے کی صلاحیت بھی کھو دیتی ہیں۔ ایسی بدترین حکومت کا نظام جو سرمایہ دارانہ نظام کہلانے لگتا ہے، شہر سے گاؤں تک دیمک کی طرح چاٹتا جاتا ہے۔

سیاسی نظام کو تین حصوں میں سمجھا جاسکتا ہے۔ پہلے حصے میں تاریخی اعتبار سے دیکھیں تو ہمیں اس میں فلاسفروں کے نظریات دورِ قدیم سے دورِ حاضر تک ملتے ہیں۔ دوسرے حصے میں نظری اصول بہت اہمیت کا حامل ہے اس کا تعلق اصولوں اور معیاروں کے معاملات پر ہوتا ہے۔ تیسرے حصے میں عملی اعتبار سے کسی خاص نظام کو لیا جاتا ہے۔ ریاستی اداروں اور معاشرے میں فرق یہ دیکھا جاتا ہے کہ ریاست میں کون سے ادارے ہیں جو ایک منظم طریقے سے حکومت بنا سکتے ہیں اور معاشرے کے اندر امن قائم کرسکیں۔ سیاسی نظام کی فضا کی طرف ول ڈیورانٹ اس طرح اشارہ کرتے ہیں:

> "جہاں حکومت صرف گروہ کے خاندان کے سربراہ کی ہوتی تھی اور کوئی مطلق العنان مقتدرہ تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ ایروقیس اور دلاورے کے انڈینز(Iroquious and Delaware Indians)خاندان اور جتھے کے نظام کے علاوہ کسی قسم کے قوانین یا پابندیوں کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کے سرداروں کے پاس معمولی اختیارات ہوتے تھے۔ جسے کسی وقت بھی قبیلے کے بزرگ ختم کرسکتے تھے۔ سات افراد پر مشتمل کونسل اوماھا کے انڈینز پر حکمرانی کرتی تھی۔ جو غور فکر کے بعد کسی متفقہ سمجھتے تک پہنچ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ایروقیس کی مشہور لیگ تھی جس کے ذریعے بہت سارے قبیلے امن وامان قائم رکھنے کے لئے اپنے آپ کو ایک جگہ اکٹھا کرلیتے اور اپنے پیمان کو پورا کرتے۔ ان "غیر متمدن" لوگوں اور جدید مملکتوں کے درمیان زیادہ بڑا فاصلہ نظر نہیں آتا جو امن قائم کرنے کے لئے خود کو اقوامِ متحدہ کے ساتھ جوڑ لیتی ہیں۔ جنگ کی بدولت سردار، بادشاہ اور ریاست وجود میں آتے ہیں اور یہی جنگ کو پیدا کرتے ہیں۔ سمووا میں جنگ کے دوران سردار بااختیار ہوتا تھا۔ لیکن دوسرے اوقات میں اُسے زیادہ اہمیت

نہیں دی جاتی تھی۔ڈیاکوں میں اپنے خاندان کے سربراہ کے علاوہ کسی حکومت نہیں ہوتی تھی۔جنگ کی صورت میں وہ اپنے سب سے بہادر جنگ جُو کو قیادت سونپتے۔اُس کی سختی سے فرماں برداری کرتے لیکن جب جنگ ختم ہو جاتی تواُسے فارغ کر دیتے امن کے دنوں میں پادری سب سے بڑا جادو گر زیادہ بااختیار اور بااثر ہوتا تھا۔جب آخرِ کار عمومی حکومت کی شکل میں مستقل بادشاہت کا قیام ہوا تو اکثر قبیلوں میں یہ جنگجوؤں اور پادریوں سے وجود میں آئی۔معاشروں پر دوقوتوں کی حکمرانی ہوتی ہے۔امن میں الفاظ اور جنگ میں تلوار، قوت صرف اس وقت استعمال ہوتی ہے۔جب ذہن کی صفائی کا عمل ناکام ہو جاتا ہے۔ قانون اور دیومالا صدیوں تک ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے ہیں یا تو یہ باہمی تعاون سے یاباری باری نسلِ انسانی کا انتظام سنبھالتے رہے ہیں۔ہمارے اپنے عہد تک کوئی ریاست انہیں الگ نہیں کر سکی اور غالباً کل پھر وہ متحد ہو جائیں گے۔"[۳۴]

سیاست اقتدار کے حصول میں کوشاں رہتی ہے۔سیاست تدبیر،زیرکی،سازش، مسلح طاقت اور لوگوں کی رائے اور اجتماعی خواہشات کے تحت اپنے مقاصد کے حصول کی کوشش کرتی ہے۔سیاست کی بنیاد اس اصول پر ہوتی ہے کہ معاشروں پر حکومت کے لیے نظام سیاست اور قوانین کو حالات و ماحول کے تحت تبدیل ہوتے رہنا چاہیے تاکہ انسانی معاشرہ ایک جگہ ٹھہرنے کے بجائے حرکت پذیر رہے۔اسلامی معاشرے اوراسلامی ریاست میں ہر شخص اللہ کا غلام اور انسانیت کا خادم تصور کیا جاتا ہے۔ اس سیاسی نظام میں نسل ورنگ کا امتیاز نہیں ہوتا۔سب کی ضروریات بیت المال سے پوری کی جاتی ہیں۔عام شخص کو بھی نظام حکومت پر تعمیری تنقید کی اجازت حاصل ہوتی ہے۔ قانون کی پاس ہوتی ہے امیر غریب اور شاہ گدا یکساں ہوتے ہیں۔عریانی اور فحاشی کی اجازت نہیں دی جاتی اور انسانیت کی بنا علم پہ رکھی جاتی ہے۔

انسانی زندگی میں خوشی غمی کا سلسلہ ابتدا سے جاری ہے۔اسی لیے صبر کے ساتھ زندگی کو گزارنا ہی اچھا راستہ ہے۔مشکل حالات میں پریشان انسان مزید پریشانیوں کو اپنے اوپر حاوی کرلیتے ہیں۔داخلی اور خارجی غموں کو انسان خود نہیں روک سکتا کوشش اور صبر کر کے اس کو آسانی سے گزار سکتا ہے۔رنج اور خوشی انسانی زندگی کے دو اہم مرکب ہیں۔رنج ایک بیل کی صورت انسان کے گرد پھیلتی رہتی ہے۔ناول نگار نے خوشی غمی کو انسانی زندگی کے حوالے سے اپنے کردار جمال کے ذریعے کہلوایا ہے:

"برٹرینڈ رسل اپنی ایک کتاب میں خوشی کے بارے میں تفصیلاً لکھتا ہے۔ اس کتاب کا نام ہے "خوشی کی تسخیر"۔ کہتا ہے "رنج داخلی ہوتا ہے اور خارجی بھی یعنی رنج و ملال اور ناخوشی کسی حد تک معاشرتی نظام کی پیداوار ہیں اور کچھ انفرادی نفسیات کی۔ کہتا ہے کہ خوش رہنے کے لیے میں نے دھیرے دھیرے سیکھا کہ اپنی ذات اور محرومیوں سے بیگانہ ہو جانا ضروری ہے۔ چنانچہ میں نے بیرونی اشیاء کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ بیرونی دلچسپی کوفت سے بچاؤ کا ذریعہ ہے۔ رسل کی تحریروں میں زندگی کے اسرار و رموز بہت بے ساختہ انداز میں چاک ہوتے ہیں اور زندگی کی اصل حقیقت سامنے آتی ہے۔"[۳۵]

جمال نے مندری والا اور اس کی بیٹی شینا کو خوشی غمی کے حوالے سے کہا کہ رسل نے خوشی کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں انسانی زندگی میں رونما ہونے والے جذبات جن کا تعلق خوشی اور غمی کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسان کے غم داخلی اور خارجی حوالے سے اس معاشرے میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انھی رنج و غم سے بہت کچھ سیکھتا ہے اور اپنی زندگی پر نظر ثانی کرتا ہے۔ جمال نے کہا کہ رسل کی تحریریں کو پڑھ کر انسانی زندگی میں چھپے بہت سے راز کا پتا چلتا ہے اور ہم اس نکتہ پر پہنچتے ہیں کہ زندی کی اصل تعریف کیا ہے۔ زندگی کی حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے یعنی انسان ایک آئینے کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔

علم ارضیات زمین کے مطالعے کا نام ہے۔ اسے سائنسی علم بھی کہتے ہیں۔ زوزمرہ زمینی تبدیلیوں سے زمین کا مطالعہ اس علم کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ گرمی، بارش، ہوا، برف، اوس،، حیوانات اور نباتات کے بارے میں جاننا علمِ ارضیات کے ذریعے سے ہی ہوتا ہے۔ زمین کے اندر تبدیلی ہونے والی حالتوں میں زلزلہ اور آتشِ فشاں رونما ہوتے ہیں۔ کس طرح ہوتے ہیں یہ بھی علم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ پہاڑوں سے پانی کا راستے بنانا اور ندی نالوں کی شکل بن جانا۔ تمام قدرتی مناظر کا علم اسی علم پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ زمین کے اندر سود مند ذخائر کے بارے میں معلومات رکھنا اور یہ اندازہ لگانا کہ کس جگہ کون سی معدنیات پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر گیس، تیل، پانی، نمک، ہیرا، لوہا وغیرہ۔ اسی طرح اس علم کے ذریعے ہم کسی بھی مقام پر کوئی عمارت بنانے کے قابل ہوتے ہیں۔ جیسے سڑکوں، ریلوں کی پٹری، بجلی گھروں کی تعمیر ہر جگہ بنانا ممکن نہیں ہوتا اس کے لیے یہ جاننا ضروری ہوتا ہے کہ اس یہ ان کاموں کے لیے ٹھیک ہے کہ نہیں ہے۔ کیونکہ ماہر علم ارضیات باقاعدہ اس جگہ کی مٹی، پتھر کو لیب میں ٹیسٹ کرتے ہیں۔ اسی طرح وہاں کے ماحول کو بھی مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ یعنی اس سائنسی علم

کا انسانی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ناول نگار وحید احمد نے اس حوالے سے اس ناول کے مختلف کرداروں سے علم ارضیات کی اہمیت کو بیان کیا ہے:

> ”جب میں اور کنگ کیلفورنیا میں پڑھتے تھے تو کنگ ارضیات میں ہمیشہ اوّل آتا تھا پھر وہ اسی مضمون کا ماہر بنا اس نے دُنیا میں تہلکہ مچا یا۔“[۳۶]

ٹینا جو مندری والا کی بیوی تھی وہ اپنے دوستوں سے اپنے کالج کے دور کی بات بتاتی ہے کہ کنگ جو کہ مندری والا تھا۔ اسے کالج میں سب کنگ کہتے تھے۔ ٹینا بتاتی ہے کہ مندری والا یعنی کنگ بہت لائق طالب علم تھا۔ اسے علمِ ارضیات سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی کلاس تمام طلبا سے لائق تھا اور اول آتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے اس مضمون میں بہت مہارت حاصل کر لی اور پوری دُنیا میں مشہور ہو گیا۔ یعنی علمِ ارضیات کی اہمیت ہر معاشرے میں کس قدر ضروری ہے ٹینا مزید دوستوں کو بتاتی ہے:

> ”ڈینئل دُنیا بھر میں بہترین ماہرِ ارضیات تھا۔ وہ زمین سے باتیں کرتا تھا۔ زمین اس کا جواب دیتی تھی۔ ڈینئل میں کچھ غیر مرئی قوتیں بھی تھیں۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو سائنس اور وجدان کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ دِس باسٹرڈ ڈینئل وازوَن آف دیم۔ وہ سطحِ زمین پر کھڑا ہو کر زمین کے اندر میلوں تک دیکھ لیتا تھا۔ یہاں تیل ہے۔ یہاں گیس ہے۔ یہاں سونا ہے۔ تانبا ہے۔ لیتھئیم ہے۔ یورنیم ہے۔ چاندی ہے۔ سائنس دان آلات لگا کر دیکھتے تو اس کی اکثر باتیں سچ ہوتیں۔“[۳۷]

ڈینئل بھی علمِ ارضیات کا ماہر تھا۔ وہ ایسا شخص تھا کہ زمین کے بارے میں ہر وقت کسی نہ کسی حوالے سے بات کرنا خوب جانتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے علم کے مطابق بتا دیتا تھا کہ اس علاقے میں اس جگہ زمین کے اندر کون کون سے ذخائر موجود ہیں۔ ٹینا نے کہا کہ ڈینئل زمین پر کھڑے ہوتے ہوئے زمین کے اندر دور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا یعنی کہاں کہاں زمین کے اندر سود مند ذخائر موجود ہیں بتا دیا کرتا تھا۔ یہاں سونا ہے یہاں تانبا، چاندی، یورنیم ہے۔ ڈینئل کی باتیں سن کر سائنس دان سائنسی آلات لگا کر اسے چیک کرتے اور بہت زیادہ اس کی باتیں سچ بھی ثابت ہو جاتیں۔

ایران اور عراق کی جنگ انیس سو اسی میں شروع ہوئی جو تقریباً آٹھ برس تک جاری رہی۔ اس جنگ میں دونوں ملکوں کا بہت جانی اور مالی نقصان ہوا۔ اگر فائدہ ہوا تو امریکہ اور اسرائیل کو ہوا اور ان کمپنیوں کو ہوا جو اسلحہ

بناتی تھیں۔ ایرانی عراق میں گھس کر شیعہ آبادی کی طرف مدد کے لیے گئے کیونکہ ایرانی افواج شیعہ تھی لیکن انہیں بہت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ عراقیوں نے دوبارہ اپنے علاقے ایرانیوں سے چھین لیے۔ اس جنگ میں عرب کے زیادہ ممالک نے عراق کا ساتھ دیا تھا۔ اس طرح جنگ آٹھ برس جاری رہنے کے بعد انیس سو اٹھاسی میں ختم ہوئی۔ اس جنگ میں جو جانی نقصان ہوا وہ اندازے کے مطابق عراقیوں کے فوجی چار لاکھ اور ایرانیوں کے تقریبا چھ لاکھ جاں بحق ہوئے۔ شیعہ سنی کا جو معاملہ ہو تا رہا اس سے ساری دُنیا واقف تھی۔ اس جنگ سے ان دونوں کے معاشرے تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ ناول نگار نے ناول 'مندری والا' میں ناول کے ایک اہم کردار کو بھی اس جنگ میں شامل دکھایا ہے۔:

> "ایران، عراق، جنگ ہو رہی تھی۔ کنگ نے حسبِ معمول اس میں دلچسپی لی۔ اُلٹے سیدھے مشورے دیئے۔ ایران اور عراق دونوں نے کہا کہ ہماری طرف سے لڑو۔ کنگ چونکہ دیوانہ ہے۔ ایک فوجی دستے کے ساتھ چل نکلا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ عراقی فوج ہے۔ حالانکہ وہ ایرانی تھے۔ یہ ان کے ساتھ مارا مارا پھرتا رہا۔ کئی دن بعد واپس آیا تو بولا۔ یہ میں کس کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ ایران کی یا عراق کی۔ شیعہ کی یا سنی کی۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے کہا۔ ہیل وِدیو۔ تم جہاں ہنگامہ دیکھتے ہو، شامل ہونے کی کوشش کرتے ہو۔"[۳۸]

ٹینا نے مندری والا کو ماہرِ ارضیات کے علاوہ ایک جنگجو کی صورت میں بھی پیش کیا۔ اس نے کہا کہ جب ایران اور عراق کی جنگ ہو رہی تھی۔ تو کنگ یعنی مندری والا اس جنگ میں شامل ہو گیا اور اسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ ایرانیوں کے ساتھ ہے یا عراقیوں کے ساتھ ہے۔ جہاں بھی کوئی ہنگامہ دیکھتا۔ کنگ مندری والا وہاں پہنچ جاتا۔

افغانستان اور روس کے درمیان جنگ تقریبا نو سال تک جاری رہی اور بہت سے ممالک نے افغانستان کی مدد کی۔ روس جو کہ ایک کمیونسٹ ملک کہلاتا تھا۔ افغانیوں کا دینی حوالے سے بھی ایک جذبہ تھا کہ وہ اللہ کے دشمنوں سے لڑ رہے ہیں۔ اس جنگ میں پاکستان کے مجاہدین نے بھی بھرپور افغانیوں کا ساتھ دیا تھا۔۔ ناول نگار نے ناول کے اہم کردار مندری والا کو جنگ میں جنگجو کی صورت میں پیش کیا ہے:

" دنیا بھر کے مسلح لوگ قافلوں کی شکل میں جنگی جنون لیے افغانستان میں اُتر رہے تھے۔ کنگ متضاد احساسات کی یک جائی، دوجذبیت یادو گرفتگی کا شکار تھا۔ اس کا دل بے اختیار جنگ کرنے کے لیے بے قرار ہوا۔ اس نے کمیونسٹوں کے خلاف ہتھیار اُٹھایا اور بر سرِ پیکار ہو گیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ کمیونسٹوں کے حق میں جنگ کی جائے۔"[۳۹]

افغانستان میں جب امریکہ نے اپنی فوج اتاری تو کنگ پھر کسی کے مخالف کسی کی حمایت میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے کمیونسٹوں کے خلاف ہتھیار اٹھایا اور ایک فوجی دستے میں شامل ہو گیا۔ اس جنگ میں کمیونسٹوں کو شکست ہوئی تھی۔ وارث علوی لکھتے ہیں:

"روسی انقلاب کے بعد کمیونسٹ آئیڈیالوجی اتنے تغیرات سے گزری ہے اور خود کمیونسٹ سیاست اتنے تضادات کا شکار رہی ہے کہ اب لوگ آئیڈیالوجی کی بحث کم اور سیاست کی بحث زیادہ کرتے ہیں۔ کسی آئیڈیالوجی کی بنیاد پر تعمیر کیا ہوا معاشرہ بھی بالآخر تو ایک سیاسی یونٹ ہی بن جاتا ہے اور سیاست کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں اور اسی لیے سیاست میں یارِ غار کم اور یارِ شاطر زیادہ ہوتے ہیں۔ روس اور چین کے مناقشات نے بتا دیا کہ سیاست آئیڈیالوجیکل وفاداریوں سے بھی زیادہ طاقت ور ہوتی ہے۔ پھر دوسری جنگِ عظیم کے بعد انقلابی سرگرمیوں نے جب سے گوریلا جنگ کی شکل اختیار کی ہے، تب سے خود سیاست سماجی زندگی کے ایک اہم عنصر کا مقام کھو چکی ہے۔"[۴۰]

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا معاشرہ معاشرتی انتشار کا شکار ہے۔ اخلاقیات کے حوالے سے تو اس قدر فقدان ہے کہ بے حس لوگوں کا ہر جگہ پڑاؤ ہے لیکن احساس کی نظر دیکھنے والا ایک فرد بھی نہیں ملتا۔ ہر شخص کے اندر حسد اور انتشار پھیلانے کا رویہ موجود رہتا ہے۔ لوٹ کھسوٹ، بد عنوانی، داخلی جنگ، خواتین، بوڑھے، بچوں کا قتلِ عام اور لاقانویت عام ہے۔ دورِ قدیم سے لے کر آج تک جتنی جنگیں ہوئیں ہیں انسانی جانوں کا نقصان بہت ہوا اور ملک کی معیشیت تباہ ہوئی۔ اس میں کسی کی جیت نہیں ہوتی کیونکہ جنگ میں سرخرو ہونے والے کو بھی جانی اور مالی نقصان ہوتا ہے۔ اس طرح معاشرہ بنتا نہیں بلکہ بکھرتا رہتا ہے۔ نئے معاشرے کی بنیاد رکھنے والے بھی اسی رنگ میں ڈھل جاتے ہیں۔ جس رنگ میں معاشرہ چلا آرہا ہوتا ہے۔ جنگ داخلی ہو یا خارجی معاشرے کی خوب صورتی ختم ہو کے رہ جاتی ہے۔ اس طرح کی حالات میں سماج اور جنگل میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ وحید احمد نے

اپنے ناول میں معاشرے کی وہی تصویر اپنے کرداروں سے دکھائی ہے جو کسی جنگ کے بعد اس ملک کی ہوتی ہے۔ وحید احمد لکھتے ہیں:

> ”دراڑوں بھری عمارتیں، ٹوٹی ہوئی محرابیں، غیر متوازن چھجے، چتکبری وردیاں، پتوں سے ڈھکے ہیملٹ، وردی سے لپٹے میگزین، رائفلوں کی چکنی نالیاں، برف پوش پہاڑوں سے اُتر کر وادی میں استراحت کرتی ہوئی فوجی ٹکڑیاں، پنڈلیوں تک چڑھے ہوئے چرمی بُوٹ مسلسل چلتے رہنے سے جن کا اوپری کنارہ رنگت بدلتا ہے، سر ڈھانپے ہوئے فوجی جیکٹ کی ہُڈ جو کمر پر لٹکے ہوئے ہتھیاروں سے سر دباتی ہے۔“[۱۴]

جمال نے ٹینا سے جنگی حالات کا منظر سنا تو جمال نے کہا اب میری باری ہے مجھے اجازت دو تاکہ میں بھی اُن حالات کی منظر کشی کر سکوں جو میں نے جنگ کے بعد دیکھا ہے۔ جمال نے کہا شہر کی عمار تو میں داڑیں پڑ گئی تھیں اور کچھ تو ملبہ بن گئی تھیں۔ فوجیوں کی وردیوں کے ٹکڑے اور ہیلمٹ بھی درختوں کی ٹہنیوں سے لٹک رہے تھے۔ رائفلز میگزین وردیوں میں لپٹے جگہ جگہ پڑے ہوئے تھے۔ فوجیوں کے جسم کے ٹکڑے وردیوں میں لپٹے ہوئے یہ بتا رہے تھے کہ کہاں کہاں کس کس طرح دشمنوں سے لڑے ہیں۔ ان کے جوتے اور پھٹی ہوئی جرابیں ایک ہولناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ فوجیوں کی جیکٹوں سے بارودی بو بھی آ رہی تھی۔ ایک خوف ناک منظر تھا۔ ہر تباہی جنگ شروع ہونے اور ختم ہونے تک کا منظر ہر دیکھنے والے کو بتا رہی تھی۔

سماج ایک صحیح سمت میں تب ہی آتا ہے جب وہاں اصول وضوابط اور اقدار زندگی کے حوالے سے ہوں۔ سماج اور جنگل میں یہی تو بنیادی امتیاز ہوتا ہے کہ جنگلی زندگی میں خوف ناک، طاقت ور جانوروں کی حکمرانی ہوتی ہے۔ جبکہ انسانی سماج میں اصول وضابطہ اور اقدار کو سب سے طاقت ور جانا اور سمجھا جاتا ہے۔ جہاں معاشرتی اقدار کا احترام نہیں وہاں سماج کھوکھلا ہو کے رہ جاتا ہے۔ انسانی زندگی خطرات اور انتشار کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ وحید احمد نے معاشرتی حالات کو ناول کے اہم کردار جمال کے ذریعے یہ بتایا ہے:

> ”شہر تھا یا آوازوں کی نوحہ گری تھی۔ بدبو کی دھنک قوس لگائے بیٹھی تھی۔ دھنک کا بالا بنفشی رنگ میلا اور زیریں سرخ گدلا تھا۔ دیواروں کی بنیادوں میں دفن پیشاب کی بُو سے لے کر ہر بولتے دہن کی سانسوں تک بدبو تھی۔ اُبکائی بھری، متلی بھری، غشیان بھری، لوگ دوڑتے پھر رہے تھے۔ اِدھر اُدھر۔ مقصد، بے مقصد۔ اژدہام، شور،

افراتفری۔ سرخ سگنل کے ڈیم پر ٹریفک کا پانی رُکتا اور سبز رنگ کا گیٹ اُٹھتے ہی ریلے میں بدل جاتا۔ کاروں کے شیشوں میں مقید عورتیں، مرد، بچے، تیوروں کی کراہت لیے آ رہے تھے۔ جا رہے تھے۔ جمال کے حساس ذہن میں بے چینی مدوجزر کھاتی تھی۔"[۴۲]

جمال جب کالی پہاڑی سے شہر کو لوٹا تو بہت مایوس ہوا کیوں کے یہاں کے لوگ کسی بھی حوالے سے اچھے نہیں لگ رہے تھے اور شہر سارا بدلو دار تھا۔ لوگوں میں اخلاقیات کے حوالے سے کوئی تمیز نہیں تھی۔ شہر میں بہت زیادہ شور تھا اور آب وہوا بھی بدبو دار تھی۔ سڑک کنارے دیواروں کے گرد لوگوں نے پیشاب کیا ہوا تھا۔ وہاں سے گزرنا محال ہو رہا تھا۔ یعنی کوئی قانون کی بالادستی نظر نہیں آ رہی تھی۔ لوگوں بے سمت بنا سمجھے چل رہے تھے کوئی بھی صحیح راستے پر نہیں تھا ہر کوئی دوسرے کو کاٹ رہا تھا۔ یہ معاشرہ کہاں جا رہا ہے؟ جمال نے سوچا اور بہت پریشان ہوا۔ کالی پہاڑی سے آ کر یہ چیزیں دیکھ بہت دکھی ہو رہا تھا۔ اسے یہ شہر ایک جنگل کی مانند لگ رہا تھا۔

کسی بھی ملک کے عوام ملکی مسائل اور ترقی پر اپنی رائے دیتے ہیں اور اپنے تجزیوں اور مشاہدوں سے ملک کی سماجی، سیاسی اور معاشی حالات سے پیدا ہونے والی مشکلات کو بیان کرتے ہیں۔ اپنی عملی اور تحقیقی صلاحتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بین الاقوامی ممالک کو موردالزام ٹھہرا کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں اور اپنے ایک امید کی مسکراہٹ بھی ساتھ لے جاتے ہیں جس میں کل کی کوئی اچھی خبر پوشید ہوتی ہے۔ لیکن صورتِ حال کے مطابق سیاسی نظام ایک منظم نظام بنانے میں ناکام ہے۔ ایک طرف امیر طبقہ سر اٹھائے پھر رہا ہے اور دوسری طرف چھوٹا طبقے کے غریب لوگ اپنی زندگی کو گھیسٹ کر صبح سے شام تک لے جاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ جو بات ہر طبقے کے لیے خوف ذدہ ہوتی ہے وہ دہشت گردی ہے۔ جس نے ساری دُنیا کو ننگی کا ناچ دکھایا ہوا ہے۔ ایک طرف سے آواز آتی ہے کہ تبدیلی آ کے رہے گی اور دوسری طرف سے آواز اس کے برعکس ہوتی ہے کہ تبدیلی تم کیا لاؤ گے تم میں اتنا دم نہیں ہے کہ کچھ دن حکومت کو چلا سکو۔ اس طرح کی صورتِ حال سے تخریب کار لوگوں کو موقع ملتا ہے اور کارروائی کرنے میں وقت نہیں لگاتے۔ معاشرے کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ناول نگار نے بھی جمال کے ذریعے سے اس طرف اشارہ کیا ہے:

"جب ہم ملکی صورتِ حال کو بین الاقوامی تناظر میں دیکھتے ہیں تو کھلتا ہے کہ ہماری سیاسی غربت تو دراصل مفلوک الحالی ہے جس کا سفر پاتال کی طرف ہے۔ آج ہم اس امیر مگر فاتر العقل بھکاری کی طرح ہیں جو اپنی دولت سے یکسر بے خبر ساری دُنیا میں کشکول اُٹھائے

بھیک مانگتا ہے۔ ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ دُنیا کے ستم ایجاد اسی بھکاری کا کچھ پیسہ کشکول میں ڈال کر احسان کرتے ہیں۔ رُوحِ عصر بے چین ہے۔ بین الاقوامی دہشت گردی ایک طرف اور ہمارے ملک میں قیادت کا بحران دوسری طرف۔ چکی چل رہی ہے۔ دونوں پاٹوں میں گیہوں بھی پس رہا ہے اور گھُن بھی۔ اب تبدیلی آئے گی اور کوئی روک نہیں سکتا۔ کوئی نہیں روک سکتا۔"[۴۳]

جلسہ گاہ میں جمال لوگوں کو ایک جذباتی تقریر کرتے ہوئے بتا رہا تھا کہ اپنے ملک کے حالات کو غیر ملکی تناظر سے دیکھتے ہیں تو ہمیں لگتا ہے کہ ہم کتنے کمزور ہیں ہماری مینجمنٹ خراب ہے اور اس وجہ سے ملک میں غربت بہت زیادہ ہے۔ غربت کی وجہ سے بہت سی معاشرتی برائیاں بھی پھیل رہی ہیں۔ بڑے اور طاقت ور طبقے کے لوگ اس حوالے سے کسی بھکاری سے کم نہیں کیونکہ وہ اپنے ملک کے بارے میں بالکل نہیں سوچتے کیسی ستم ظریفی کی بات ہے۔ ان حالات ملک کا حکمران دوسرے ممالک سے قرض بٹورتا ہے۔ اس سے مزید حالات خراب ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ایک طرف حکومتی ریاستی ٹیم اور دوسری جانب اپوزیشن جو اپنی ہٹ دھرمی میں اڑے ہوتے ہیں۔ انھوں نے بھی ملک کے لیے کچھ نہیں سوچنا ہوتا ہے۔ ایک تبدیلی کی بات کرتا ہے تو دوسرا حکومتی اقدامات پر تنقید کرتا ہے۔ ظہیر احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"اس زمانہ میں قوم ذہنی اعتبار سے کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک طبقہ وہ تھا جو ماضی کی روایتوں اور قدروں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مغرب کا حسین ملمع جلد اثر کر جائے گا۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جو مغرب سے اس حد تک مرعوب اور خوفزدہ ہو چکا تھا کہ اس کی ہر آواز پر لبیک کہتا۔ وہ مغرب کے دھارے پر ایک بے بس تنکے کی طرح بہہ رہا تھا۔ تیسرا گروہ وہ تھا جس نے مغرب سے آنے ولاے نظام کو خوش آمدید کہا، اس لیے نہیں کہ وہ باہر سے آنے والی قوم سے کچھ خوش تھا یا اپنی غلامی پر راضی تھا بلکہ وہ جانتا تھا کہ اب پیچھے کی طرف دیکھنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس طبقے نے نئے نظام سے سمجھوتا کر لیا۔"[۴۴]

تیسرے طبقے نے برعظیم کے عوام کی ذہنی تربیت کی۔ گزرتے حالات کے پیش نظر لوگوں نے اپنے کھویے ہوئے وقار کو پھر سے حاصل کرنے کے لیے نئے راستے چنے تھے لیکن مذہبی تعصب، سماجی ناہمواری، نسلی امتیازات، جہالت، پسماندگی، باہمی منافرت، کشیدگی اور غلامی جیسے مسائل کو حل کرنے اور معاشرے میں شعور پیدا کرنے کے لیے اقدام اٹھانے پڑتے ہیں۔

یہ عام سی بات ہے اور ہر کوئی جانتا ہے کہ جب بھی الیکشن قریب آتے ہیں تو ہر لیڈر اپنا قریبی دوست بن جاتا ہے۔ تقریریں بہت کی جاتی ہیں اور بہت سے وعدے کیے جاتے ہیں۔ لیڈر اپنے لہجے کو نرم رکھتے ہیں اور روزانہ غریبوں کی بستیوں گھسے ہوتے ہیں۔ اُن کو اس دفعہ کچھ اچھا کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے یقین دلاتے ہیں کہ اس بار آپ کے سارے کام کر دیے جائیں گے۔ بس ووٹ دیتے ہوئے ہمیں یاد رکھیے گا۔ ہر پارٹی بڑھ چڑھ کر کام کرتی ہے۔ ایک دوسرے کے مخالف نعرے بازی ہوتی ہے اور ایک اچھے لیڈر کو خریدنے کے لیے پیسہ پھینکا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں بھی ناول نگار نے الیکشن میں منافقت کی نشاندہی اور ناول کے ہیرو ناول کو بطور ایک لیڈر پیش کیا ہے:

> ”الیکشن سر پر تھے۔ اگرچہ برسرِ اقتدار پارٹی نے جمال کو عزت، شہرت اور دولت کی بلندیوں پر پہنچایا مگر مخالف پارٹی نے اسے بہتر شرائط پر اپنے گروہ میں شامل کر لیا۔ مخالف پارٹی نے جب جمال کو خریدا تو یہ طے کیا کہ وہ پارٹی اس کی موجودہ مالی صورتِ حال کو کم از کم دوگنا کر دے گی۔“[۴۵]

جمال جو کہ ایک اچھا اور لائق لیڈر تھا۔ مخالف پارٹی کے لوگ بھی اسے سننے کے لیے آتے تھے۔ جمال کی پارٹی اراکین بہت عزت دیتے تھے وہ جانتے تھے کہ جمال دوسری پارٹی کو باآسانی الیکشن ہرا سکتا ہے اور یہ بات مخالف پارٹی بھی خوب جانتی تھی اسی لیے مخالف پارٹی نے جمال کو مہنگے داموں خرید لیا۔ اس طرح کے معاملات ملک کی مختلف پارٹیوں میں ہوتا ہے جسے جوڑ توڑ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

عالمی امن و سلامتی کے لیے بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جاتی ہے۔ مختلف ممالک ایک میز پر آکر بیٹھتے ہیں۔ دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے سنگین خطروں کو روکنے کے لیے صلاح اور مشورے کیے جاتے ہیں۔ دہشت گردی جو ایک ناسور زخم کی طرح ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک پھیلتا جاتا ہے اور پھر

دُنیاان حالات سے دوچار رہتی ہے۔ اس کو اگر روکا نہ گیا تو معاشرہ اور قومیں جلد تباہ ہو جائیں گی۔ دہشت گردوں کو سہارا دینے والوں کو روکا جائے تو یہ چیز جڑ سے اکھاڑ دی جا سکتی ہے۔ کچھ اس طرح کے امکانات پیدا کیے جائیں کہ دہشت گردوں کے معاونت کار کو کیفرِ کردار پہنچایا جائے۔ وحید احمد ناول نگار نے دہشت گردی کے بارے میں کچھ چیزوں کا ذکر کیا ہے:

> ''کئی دِنوں سے انسدادِ دہشت گردی کے موضوع پر بین الاقوامی اعلیٰ سطحی اجلاس دارالحکومت میں جاری رہا تھا۔ مختلف ممالک کی امن کمیٹیوں کے ممبر اس اجلاس میں شریک تھے۔ دہشت گردی کو معاشرے کا ناسور، حکومتوں کے عدم استحکام کا سبب اور گھناؤنی سازش قرار دیا گیا۔ دُنیا کے مختلف ممالک میں دہشت گرد تنظیموں کی کارروائیاں اوران کا باہمی تال میل موضوعِ گفتگو رہا۔ اکثر مقامات پر ان تنظیموں کی بیخ کنی پر طمانیت کا اظہار ہوا۔ بین الاقوامی وفد کا سربراہ البرٹ مکین نہایت سنجیدگی سے تمام صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔''[۴۶]

بین الاقوامی کا اجلاس ملک کے دارالحکومت میں جاری تھا جس میں جمال بھی شامل تھا۔ ملک کی امن کمیٹیوں کے اراکین نے بھی دہشت گردی جیسی ناسور بیماری کو ختم کرنے کے لیے اجلاس بلایا گیا۔ بین الاقوامی سربراہ البرٹ مکین نے دہشت گردی کے حوالے بات کی اور اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے تمام اراکین سے مختلف حوالوں سے بات کی تا کہ ملک سے معاشرے سے دہشت گردی ختم کی جائے۔

حوالہ جات

۱۔ وحید احمد، مندری والا، مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۷

۲۔ کرسٹین پرائیس، اسلامی فنون کی داستان، مترجم، ہلال احمد زبیری، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۶۸، ص ۳۴

۳۔ وحید احمد، مندری والا، ص ۱۸

۴۔ ایضاً، ص ۸۱

۵۔ ایضاً، ص ۸۳

۶۔ ایضاً، ص ۸۵

۷۔ ڈاکٹر شفق سوپوری، مخزنِ موسیقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۱۳

۸۔ وحید احمد، مندری والا، ص ۸۷

۹۔ ایضاً، ص ۱۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۹

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۶

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۴

۱۳۔ جمال پانی پتی (مرتب)، مضامینِ سلیم احمد، اکادمی بازیافت لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۸۱۹

۱۴۔ وحید احمد، مندری والا، ص ۵۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۲

۱۶۔ ایضاً، ص ۹۸،۹۹

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۴۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۴۹

۲۱۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، سنگِ میل پبلیکشرز لاہور، ۲۰۰۴، ص ۲۶

۲۲۔ وحید احمد، مندری والا، ص ۷۴

۲۳۔ ایضاً، ص ۷۷

۲۴۔ ایضاً، ص۷۷

۲۵۔ ایضاً، ص۷۸

۲۶۔ ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقا، (مترجم) تنویر جہاں، ص۲۸

۲۷۔ وحید احمد، مندری والا، ص۷۸

۲۸۔ ایضاً، ص۱۵۶

۲۹۔ ایضاً، ص۱۷۱

۳۰۔ ایضاً، ص۴۳

۳۱۔ ایضاً، ص۹۱

۳۲۔ ایضاً، ص۹۲

۳۳۔ ایضاً، ص۵۳، ۵۴

۳۴۔ ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقا، (مترجم)، تنویر جہاں، ص۲۸

۳۵۔ وحید احمد، مندری والا، ص۳۳

۳۶۔ ایضاً، ص۱۰۴

۳۷۔ ایضاً، ص۱۰۵

۳۸۔ ایضاً، ص۱۱۱

۳۹۔ ایضاً، ص۱۱۰

۴۰۔ وارث علوی، منتخب مضامین، فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ کراچی، ۲۰۰۰ء، ص۱۴۰

۴۱۔ ایضاً، ص۱۱۶

۴۲۔ ایضاً، ص۱۳۰

۴۳۔ ایضاً، ص۱۵۲

۴۴۔ ظہیر احمد صدیقی، فکری زاویے، نئی دہلی قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۰ء، ص۸

۴۵۔ ایضاً، ص۱۵۲

۴۶۔ وحید احمد، مندری والا، ص۱۷۰

باب چہارم:

"زینو" اور "مندری والا" کا تقابلی مطالعہ

الف۔ تقابلی مطالعہ:

دو چیزوں کے درمیان اُن کی خصوصیات کے اشتراکات اور امتیازت کو اس طور پر تجزیاتی حوالے سے پیش کرنا کہ ہر ایک کی خصوصیت نمایاں ہو جائے۔

ب۔ ناولوں کا پس منظر:

دورِ حاضر میں اردو ناول کے موضوعات میں بہت وسعت سامنے آئی ہے۔ بد عنوانی ، ریاستی یلغار، گلوبلائزیشن، دہشت گردی ،اخلاقیات، عورت کا مقام، سیاسی انتشار،لاقانونیت،اقتصادی حالات ،تہذیبی شکست،طبقاتی کشمکش،بدامنی اور فرقہ واریت جیسے مسائل جدید دور میں جدید ناول مختلف اسالیب اور موضوعات کے طور پر موجود ہیں۔ناول کا تعلق ہر دور کے معاشرے سے ہے۔ یہ انسانی زندگی کے نظام سے متعلق تمام پہلوؤں کا اظہاریہ ہے۔ جدید دور میں تہذیبی ثقافتی حوالے کا ترجمان ہے۔ اس لیے اسے دورِ حاضر کا رزمیہ بھی کہتے ہیں۔

ج۔ تہذیبی عناصر کے حوالے سے دونوں ناولوں کا تقابلی مطالعہ:

زینو ناول میں سماجی اقدار کے حوالے سے زینو کا کردار ایک تاریخی شخصیت ہے اور ایک فلاسفر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ معاشرے میں اس کا ایک اہم مقام ہے۔ لوگوں میں گھل مل جاتا ہے۔ ارسطو جیسے فلاسفر سے بات آسانی سے کرتا ہے۔ کسی قسم کی جھجک نہیں اسے ہوتی۔ زینو کی گفتگو میں جادو ہے۔ جو ہر کسی کو اپنی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ یعنی سماج میں زینو کا مقام بہت اہمیت رکھتا ہے۔ درجہ ذیل اقتباس میں زینو کا کردار نکھر کے سامنے آتا ہے:

> "ارسطو نے دیکھا کہ ایک انتہائی حسین و جمیل نوجوان اُس سے ہم کلام ہے ۔ وہ
> دونوں ساحل پر چلنے لگے۔ جب نوجوان پر کھلا کہ وہ ارسطو کے ساتھ چل رہا ہے تو

اُسے خوشی ہوئی جب زینو کی علم سے مزین گفتگو نے اُسے اپنی طرف کھینچا تو وہ چلتے چلتے رُک گیا بولا"۔۔۔"دورانِ گفتگو تمہارے ہاتھوں کے اشارے اور لفظوں سے ٹپکتا ہوا علم گواہی دیتا ہے کہ تم میرے ایک ہم جماعت کے بیٹے ہو جو اسی انداز میں مگر ذرا تیز گفتگو کرتا تھا۔"[1]

اسی طرح اگر ہم ناول 'مندری والا' دیکھیں تو اس میں بھی سماج، معاشرے کے حوالے سے بہت سی موضوعات ملتے ہیں۔ معاشرے میں قابل فرد ہی ملک و قوم کی زینت ہوتے ہیں۔ انہی لوگوں کی وجہ سے ہی معاشرے کو تقویت ملتی ہے۔ مندری والا ناول کا مرکزی کردار جمال بھی معاشرے کے ایک اہم ستون کی حیثیت سے سامنے آیا ہے:

"آپ ملک کے عظیم دانش ور ہیں جمال صاحب اور پھر الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں آپ کا خاصا اثر ورسوخ ہے۔ حکومت آپ کی قدر کرتی ہے اور احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔"[2]

محولا بالا اقتباسات سے واضح ہے کہ ناول زینو اور ناول مندری والا میں دونوں مرکزی کردار میں زبان وبیان اور اظہار و ابلاغ کے حوالے سے ہیرو ہیں اور قاری کے قلب وذہن کو متاثر کرتے ہیں۔

سیاسی انتشار، سیاسی مکر و فریب اور خود غرضی کے حوالے سے موضوعات ناول زینو میں ملتے ہیں۔ جیسے کہ زینو کا سکندر سے مکالمہ:

"تمہیں فوج رکھنے کا شوق ہے۔ تم فوج رکھو، اس کی پرورش کرو، مگر یونان تک محدود رہو تم ایک امیر بادشاہ بن سکتے ہو۔ اگرچہ ارسطو کی طرح میں بھی بادشاہت کے خلاف ہوں۔ شہری ریاستوں کا اصول اچھا ہے۔ مختصر آبادی کی ریاست زیادہ منظم طریقے سے چل سکتی ہے۔ مگر تم حالات کو اس نہج پر لے آئے ہو کہ بادشاہت کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہیں آتا تو ٹھیک ہے۔۔۔ تم ملک یونان کے بادشاہ بنو، دارا اتنا امیر نہیں ہے۔، جتنے تم ہو جاؤ گے۔ بادشاہت اگر امیر ہو تو سرحدیں محفوظ ہو جاتی ہیں اور اندرونِ ملک سکون رہتا ہے۔۔۔ تو شرط یہ ہے کہ خزانہ حاصل کرنے کے بعد تم یونان تک محدود رہو گے۔"[3]

ناول مندری والا میں بھی معاشرے میں سیاسی حالات کے بھیانک فسادات اور مکروفریب جیسے موضوعات ملتے ہیں:

”جب ہم ملکی صورتِ حال کو بین الاقوامی تناظر میں دیکھتے ہیں تو کھلتا ہے کہ ہماری سیاسی غربت تو دراصل مفلوک الحالی ہے جس کا سفر پاتال کی طرف ہے۔ آج ہم اس امیر مگر فاتر العقل بھکاری کی طرح ہیں جو اپنی دولت سے یکسر بے خبر ساری دُنیا میں کشکول اُٹھائے بھیک مانگتا ہے۔ ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ دُنیا کے ستم ایجاد اسی بھکاری کا کچھ پیسہ کشکول میں ڈال کر احسان کرتے ہیں۔ رُوحِ عصر بے چین ہے۔ بین الاقوامی دہشت گردی ایک طرف اور ہمارے ملک میں قیادت کا بحران دوسری طرف۔ چکی چل رہی ہے۔ دونوں پاٹوں میں گیہوں بھی پس رہا ہے اور گھُن بھی۔ اب تبدیلی آئے گی اور کوئی روک نہیں سکتا۔ کوئی نہیں روک سکتا۔“[۴]

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحید احمد کے دونوں ناولوں کے اندر سیاسی نظام کے حوالے سے ہر طرح کے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ سیاسی مکروفریب ، بدعنوانی، حکومت کا جبر واستحصال ،سیاسی تغیرات وتحریکات دونوں ناولوں میں موضوعات پائے جاتے ہیں۔

ناول زینو میں سکندر کے حوالے سے اخلاقیات کی بے راہ روی بہت زیادہ ملتی ہے۔ معاشرے کی ساکھ کو نقصان دینے والی حرکات عام ہوتی ناول میں دکھائی گئی ہیں۔ شراب نوشی، ناچ گانا، محفلوں کا سجنا وغیرہ جیسے موضوعات ناول زینو میں ملتے ہیں۔ ذیل اقتباس میں سکندر نے اپنی جیت کی خوشی میں محفل برپا کی:

”مخروطی جام بھرے ہوئے تھے۔ بیسیوں رقاصائیں ناچ رہی تھیں۔ موسیقی کی دُھن پر جھومتے ہوئے سپاہی دادِ عیش دے رہے تھے۔“[۵]

مندری والا ناول میں بھی شراب نوشی، گانا اور رقص کی محفلیں، اخلاقی بے راہ روی، معاشرتی بیماریوں کا احاطہ کیا ہے۔ وحید احمد نے اپنے اس ناول میں بھی غیر اخلاقی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے کہ معاشرے میں کس طرح کے عناصر اب بھی زندہ ہیں:

"یکا یک دورِ مے نوشی تیز کر دیا گیا۔ جانسن نے ہاتھ میں گرانی کی۔ جام حجم میں بڑھنے لگے۔"[۶]

دونوں ناولوں میں سماج کے تلخ اور کڑوے سچ کو سامنے لایا گیا ہے۔ دورِ قدیم سے لے کر دورِ حاضر تک معاشرتی بیماریوں میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

ماحولیات اور ادب کا گہرا تعلق ہے۔ ماحولیات کا انسانی زندگی سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دورِ قدیم سے لے کر آج کے دور تک تہذیبوں نے ماحولیات کے حوالے سے بہت اقدام کیے ہیں۔ ناول زینو میں ماحولیات کی جزئیات نگاری کی گئی ہے۔ جیسے کہ وحید احمد بیان کرتے ہیں:

"انواع واقسام کے درخت تھے یونان میں شاہ بلوط، زیتون، جونیپر، صنوبر اور پاپلر کے درخت نظر آتے تھے مگر یہاں ان درختوں کے علاوہ ناریل کے درختوں کا جنگل تھا اور کچھ ایسے درخت بھی تھے جو ان لوگوں نے پہلے نہیں دیکھے تھے پرندوں کی بہت قسمیں تھیں۔ پھل دار درختوں کی بہتات تھی جزیرہ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اس میں صاف پانی کی ایک بہت جھیل تھی۔ میدان اور ٹیلے تھے۔ بعض ٹیلے چھوٹی پہاڑیوں کے برابر تھے۔"[۷]

ماحولیات کی جزئیات نگاری ناول مندری والا میں بھی کی گئی ہے۔ زمین، پانی، فضا، ہوا کو ماحول کہتے ہیں ان میں طبعیاتی، حیاتیاتی اور کیمیائی اجزا اور عناصر شامل ہوتے ہیں۔ اس دُنیا میں جو کچھ ہے وہ ماحول میں آتا ہے یہ آب و ہوا ابتدا سے انسانوں کا ساتھ دے رہی ہے اور انسان بھی اس سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ناول نگار نے مندری والا ناول میں بھی ماحول سے متعلق نشاہدی کی ہے:

"صبح کے سورج میں زمستان کی لرزش تھی۔ ہوا میں موسمِ سرما کی آمد کا بھاری پن تھا جو جسم کے رونگٹوں کو گدگداتا ہے۔ بہار کا موسم، موسمِ گرما سے آنکھ مچولی کھیلتے کہیں نکل گیا تھا۔ اب نہایت رنگیلی اور چمک دار خزاں سردیوں کو بلا رہی تھی۔"[۸]

مندرجہ بالا اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں ناولوں میں ماحولیات کے منظر ملتے ہیں۔ وحید احمد نے اپنے دونوں ناولوں ماحولیات کی جزئیات نگاری کی ہے۔

اقتصادی ذرائع کو حاصل کرنے کے لیے سکندر نے ناجائز طریقے اختیار کیے۔ زینو ناول میں ناول نگار نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اقتصادی نظام کا بکھر تاثیر ازہ حکومت کا جبر و استحصال:

”شہنشاہیت ،ملوکیت ،سامراجیت ،استعماریت ،نوآبادیاتی نظام۔۔۔حکومت کرنے کی مختلف شکلیں شاید ہوں یانہ ہوں مگر منافع حاصل کرنے کی شکلیں بہر حال ہیں،عالمگیریت یاہمہ ارضی۔۔۔ترقی شکلیں بہر حال ہیں۔منافع چاہیے خواہ معاشرے تباہ ہو جائیں۔منافع چاہیے چاہے تہذیبیں مٹ جائیں۔اور تمدن اجڑ جائیں۔“[۹]

ناول مندری والا میں بھی اقتصادی نظام کو بہتر کرنے کے لیے معاشرے کی کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ اقتصادی ذرائع کا استعمال کرنا مندری والا میں کرداروں نے کس طرح کیا ہے، ہمیں اس ناول میں ملتا ہے۔یعنی کسی معاشرے کی بقاکے لیے سیاسی اور اقتصادی نظام کا درست ہونا بہت ضروری ہے:

”ایک بڑاہال ٹیکسٹائل مل تھا۔سوت اور ریشم ہیلی کاپٹر سے آتا اور یہاں لگی ہوئی کھڈیوں پر بُنا جاتا۔ تانے بانے میں چابک دستی سے پوریں چلتیں۔چادریں کھیس، کفن، نمدے، چٹائیاں، قالین طرح طرح کے پارچے بنتے۔ چند درزی ہاتھوں سے سوزن کاری کرتے تھے۔“[۱۰]

ناول زینو اور ناول مندری والا میں معاشرے کی اصلاح سے لے کر معاشرے کی تباہی کے منظر اقتصادی حوالے ملتے ہیں۔

فن کارنے بے مثال نمونے عمارتوں کی صورت میں، مجسموں کی صورت میں اور نقش و نگار دیواروں پر، برتنوں پر قدیم دور سے آج تک چلا آرہا ہے۔ قدیم دور کی فنی تخلیقی مہارت بھی نسل در نسل مختلف تہذیبوں کی عکاس ہے۔ناول زینو کا مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ علوم وفنون کیا ہوتا ہے اوراس میں کیا کیا سمایا ہوا ہے۔وحید احمد لکھتے ہیں:

”زینو کا باپ مجسمہ سازی اور ظروف کی نقش نگاری میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔ وہ ایتھنز کے ایک مصری مجسمہ ساز کے ساتھ کام کرتا تھا جو کوزہ گری اور ظروف سازی کے باعث بہت مشہور تھا۔“[۱۱]

کوئی بھی ناول،افسانہ اپنے علوم وفنون رکھتا ہے کیوں کہ اس معاشرے میں بسنے والے فن کاروں کی تخلیقی مہارتوں کا پتا چلتا ہے۔ ناول مندری والا میں بھی فن کاروں کی ہاتھوں سے بنی ہوئی ایسی اشیاہیں جن کے بارے میں پڑھ کر فن کاروں کی صلاحیتوں کا پتا چلتا ہے۔وحید احمد لکھتے ہیں:

"کمرہ وسیع و عریض تھا جسے ہلکے بھورے رنگ کے کارپٹ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ کمرے کے وسط میں قرمزی رنگ کا منقش ایرانی قالین بچھا تھا جس پر مور کی شبیہہ نمایاں تھی۔ جس پلنگ پر وہ سرخ کمبل اوڑھے لیٹا تھا، اس کے چاروں پائے گرجے کے مخروطی میناروں کی طرح باریک ہو کر بلند ہوتے تھے۔ ہر مینار کے گرد سنہری پینٹ تھا جو کلس کی طرح جگمگاتا تھا۔"[۱۲]

مجوزہ بالا اقتباسات سے علوم وفنون کے حوالے مختلف زاویوں سے بات کی گئی ہے۔

د۔ اشتراکات:

i۔ ناول "زینو":

سماجی اقدار، علوم وفنون، سیاسی نظام، اقتصادی ذرائع، ماحولیات، سائنس، جدیدیت کے حوالے سے موضوعات ملتے ہیں۔

ii۔ ناول "مندری والا":

ناول مندری والا میں بھی سماجی اقدار، علوم وفنون، سیاسی نظام، اقتصادی ذرائع، ماحولیات، سائنس، جدیدیت جیسے موضوعات ملتے ہیں۔

ہ۔ اختلافات:

زینو میں ماضی کا مرکزی کردار حال کی جانب سفر کرتا نظر آتا ہے۔ جبکہ ناول مندری والا میں حال کا کردار ماضی کی جانب سفر کرتا ہے۔

اس کے علاوہ زینو ناول میں یونانی تہذیب، مصری تہذیب، گندھارا تہذیب، اور پرانے دور کے نامور فلاسفر کا ذکر بھی کیا ہے۔ جبکہ ناول مندری والا میں کوئی بھی نامور کردار نہیں ہے اور نہ ہی کوئی پرانی تہذیب کا ذکر ہے۔

ایک مصلح کے روپ میں زینو اس ناول میں سامنے آتا ہے اور داراو سکندر کو جنگ سے باز رکھنے سے قاصر رہتا ہے اور نہ ہی بے گناہوں اور معصوم لوگوں کو ظلم سے بچا پاتا ہے۔

ناول مندری والا میں مرکزی کردار جمال کالی پہاڑی سے جب واپس اپنی دُنیا میں لوٹ کر آتا ہے تو ایک مصلح کے روپ میں نظر آتا ہے۔ پہلی دنیا میں آکر بھی دوسری دنیا سے اس کردار کا تعلق مشکوک ٹھیرتا ہے۔

ناول زینو میں زینو میں مکانی حوالے سے دیکھیں تو شہر ایتھیز اور تھیبیس، ریاست ایلس اور شہر اولیپیا، سپارٹا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جبکہ ناول مندری والا میں مکانی حوالے سے صرف شہر کا ذکر اور اس کے ساتھ کالی پہاڑی کا ذکر کیا گیا ہے۔

اسی طرح اگر زمانی حوالے سے دیکھیں تو ناول زینو میں ہمیں زینو کردار دورِ قدیم میں بھی متحرک لگتا ہے۔ اس کے بعد ناول نگار نے زینو کو دورِ معاصر میں دوبارہ زندہ کیا اور اس کے کردار کو متحرک دکھایا ہے۔

زمانی اعتبار سے مندری والا ناول میں کالی پہاڑی پہ وقت کو رکا ہوا دکھایا گیا ہے۔ کالی پہاڑی پر جہاں مندری والا کردار کی حویلی ہوتی ہے۔ وہاں ہمیشہ وقت گیارہ بج کر سات منٹ ہی رہتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ وحید احمد، زینو، ص ۲۷
۲۔ وحید احمد، مندری والا، ص ۵۹
۳۔ وحید احمد، زینو، ص ۵۰
۴۔ وحید احمد، مندری والا، ص ۱۵۲
۵۔ وحید احمد، زینو، ص ۸۰
۶۔ وحید احمد، مندری والا، ص ۱۰۷
۷۔ وحید احمد، زینو، ص ۱۳
۸۔ وحید احمد، مندری والا، ص ۴۴
۹۔ وحید احمد، زینو، ص ۱۵۸
۱۰۔ وحید احمد، مندری والا، ص ۸۷
۱۱۔ وحید احمد، زینو، ص ۱۰
۱۲۔ وحید احمد، مندری والا، ص ۷

باب پنجم:

ماحصل

الف: مجموعی جائزہ:

ایک جدید ناول نگار کے طور پر وحید احمد نے اپنے دونوں ناولوں میں فلسفیانہ موضوعات اور اسالیب کے ذریعے سے اردو ناول کی روایت کو ثروت مند بنایا ہے اور خاص طور پر مختلف موضوعات کو اس طرح سے ناول کے متن کا حصہ بنایا ہے کہ قاری نہ صرف کہانی سے لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کہانی میں موجود فلسفیانہ، فکری، علمی اور تہذیبی عناصر کی موجودگی سے ایک ایسے متن سے آشنا ہوتا ہے جس میں جدلیاتی انداز میں انسانی مسائل پر بات کی گئی ہے۔

بعض مقامات پر مکالموں کی کثرت اور فکریات کی پیش کش میں زیادتی کی وجہ سے ناول کا بہاؤ متاثر ہوتا ہے جس کی وجہ سے ایک جزوی تاثر یہ سامنے آتا ہے کہ ناول ایک فکری و فلسفیانہ دستاویز ہے لیکن دونوں ناول اپنی کلی پیش کش میں تہذیبی عناصر کو اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ ان جزوی مسائل کے باوجود دونوں ناولوں کو اردو کے فکری ناولوں کی روایت میں اہم ناولوں کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر وحید احمد کا ناول زینو اپنے موضوع کے لحاظ سے جدید ناول ہے۔ اس ناول میں مختلف اسالیب کے ذریعے سے قدیم و جدید انسانی موضوعات کو مختلف جہات سے برتا گیا ہے۔ اس ناول میں جو بات سب سے زیادہ بہتر انداز میں ابھر کر سامنے آتی ہے وہ تہذیبی عناصر کے مختلف اظہاریے ہیں۔ مختلف تہذیبی عناصر کے ذریعے سے اس ناول کو ادبی و فنی لحاظ سے ثروت مند بنایا گیا ہے۔

کسی بھی تہذیب کو سمجھنے کے لیے معاشرتی اقدار کی تفہیم بہت بنیادی اہمیت کی حامل ہیں ۔ معاشرہ تہذیب کے ساتھ باہمی تعلق ہمیشہ استوار رکھتا ہے۔ معاشرے میں انسانی زندگی درحقیقت ایک جماعت کی حیثیت سے ہے۔ جس میں ہر انسان رہن سہن کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی خوشگوار بنانے کے لیے اپنی ترقی اور فلاح و بہود کا راستہ چنتا ہے اور دوسرے لوگوں سے تعلق قائم کرتا ہے۔ معاشرہ کی تشکیل کے لیے مختلف و متنوع اقدار جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہر فرد کا سماج کے ساتھ علامت و ابلاغ کا تعلق ہوتا ہے۔ معاشرے کے

ڈھانچے کے لیے چند عوامل بہت ضروری ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے سب سے اول اور اہم مرحلہ زبان و ادب کا ہوتا ہے ۔زبان وادب کو معاشرے میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ معاشرے کی اول قدر اسی سے جانی جاتی ہے۔ انسان دنیا میں کہیں بھی ہو زبان وادب کے بغیر وہ نامکمل ہوتا ہے۔ معاشرتی اقدار کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ رسم ورواج، تہذیب وروایت، آدابِ زندگی، طرزِ فکر اور اخلاق و نظریات سے ہر فرد کا واسطہ پڑتا ہے۔ انسان جب کسی چیز کی تعمیر کرنے کے لیے قدم اٹھاتا ہے تو سب سے پہلے ایک مقصد اپنے سامنے رکھتا ہے اور اُس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اپنے ذہن میں منصوبہ بناتا ہے تا کہ اسی کے مطابق اسے مکمل کر سکے۔

وحید احمد کا ناول زینو اور مندری والا دنیا میں پھیلے ہوئے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ دونوں ناولوں میں شہنشاہیت، ملوکیت، سامراجیت، استعماریت اور نو آبادیاتی نظام کے بارے میں مسائل کو پیش کرتا ہے۔ ناول زینو اور مندری والا میں حکومت کرنے کی مختلف صورتیں عالمگیریت، معاشی بحران، نئی نئی ایجادات، اشتہار بازی، مشہوری کی رنگینیوں کے حوالے سے ملنے والے نتائج میں نمودار ہونے والے ہیجان اور ساری دنیا کے سیاسی ، معاشی اور تہذیبی نشیب و فراز کے واقعات سے پلاٹ ان دونوں ناولوں میں ترتیب دیا گیا ہے۔

ان ناولوں کے کردار ان مسائل سے دوچار نظر آتے ہیں جن مسائل سے اس وقت پوری دنیا نظر آرہی ہے۔ کرداروں کے مکالموں کے ذریعے سے بین الاقوامی تمام مالیاتی اداروں پر مسائل سوالیہ نشان کے طور پر قائم ہیں۔ دنیا میں معاشیات کے حوالے سے جن مسائل سے توازن رکھنے میں دشواریاں پیش آرہی ہیں، ان کے لیے تشکیل دیے گئے ادارے جو عالمی معیشت پر قابو پانے سے قاصر رہے ہیں۔ سرمایے کے ناجائز و ناجائز حصول میں آزاد مارکیٹ کے اصولوں پر اخلاقیات و بنیادی معاشرتی اقدار سے تہی سماج ایک الارمنگ صورت حال کی طرف اشارہ ہے ۔وحید احمد کے ناولوں میں اسی استحصالی نظام کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ناولوں میں اشیائے ضرورت کی قلت اور آلودگی، جنگلات کے کٹنے، معدنیات اور تیل کے لیے مختلف ملکوں کے درمیان ایک آویزش اور سمندری علاقوں میں زندگی بسر کرنے والوں کے حوالے سے ماحولیاتی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔

وحید احمد کے ناول زینو اور مندری والا میں جن مسائل کا ذکر کیا گیا ہے وہ دُنیا میں عالمی سطح پر مختلف صورتوں میں موجود ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو ان سب کا بنیادی تعلق معیشت نظام ہائے معیشت سے ہے۔ ایٹمی ہتھیاروں، بم دھماکوں، جنگوں، زہریلی گیسوں، سیلابوں، آلودہ پانی، اور ماحولیاتی اعتبار سے دوسرے تخریب

کاریوں سے معاشرے میں پیدا ہونے والے ان گنت مسائل سے دوچار ہونے والے غریب عوام مالی اعتبار سے اس قدر مستحکم نہیں ہوتے کہ وہ اپنے حالات کو بہتر کر سکیں۔

قدیم معاشروں میں انسان کے حالات کچھ اس طرح تھے کہ شکار کی صورت میں یا مشکل حالات میں وہ سیاسی تنظیم قائم کر لیتے تھے۔ مختلف سماجی تنظیموں کے ساتھ مل کر سیاسی عمل میں اپنا کردار ادا کرتے تھے۔ سماج اور سیاست کا عمل خاندان، ملکیت اور ریاست کے تصورات مضبوط کرنے کے لیے نئے ذرائع پیدوار کی تلاش جاری رکھتے۔ سیاست اور سماج کو ایک دوسرے سے الگ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تہذیبی اعتبار سے دیکھیں تو کسی بھی دور میں ان میں کوئی حقیقی افتراق نہیں تھا۔

دُنیا میں بڑے سے بڑے معاشی اور سیاسی حوالے سے مسائل کی ایک طویل فہرست فن پاروں کے حوالے سے تیار بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن مختلف موضوعات کی تعیین میں فنی وسائل کو کسی بھی طرح سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ان فن پاروں کو مختلف حوالوں سے زیر بحث لایا جاتا ہے۔ دُنیا بھر کے مسائل کو اجاگر کرنا اور ناول کے پلاٹ کی ترتیب، کرداروں کے مابین مکالمہ بازی اور فضا سازی کا مرحلہ بھی اتنا سہل نہیں ہوتا کہ ہر لکھاری اسے بہت فن کاری سے خوش اسلوبی سے نبھا سکے۔ پیشِ نظر تہذیبی عناصر کے حوالے سے ناولوں کے فنی جہات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

قدیم دور کی معلومات انسانی شکل وصورت اوران کے رہن سہن سے متعلق آگہی حاصل ہوتی ہے اور ناول نگار مختلف ادوار اور علاقوں کے تہذیبی عناصر میں سے ایک بنیادی عنصر "سماجی اقدار" پر فکشن کے پیرائے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے مکالمے کے انداز میں مختلف تہذیبوں کے فرق کو واضح کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کس طرح زندگی کے بارے میں مختلف زاویۂ نظر ایک انسان کو دوسرے انسان سے مختلف بناتا ہے اور مختلف نقطۂ نظر اور جہاں بینی کے مختلف تصورات کے انسان کے طرز عمل، اخلاقی اقدار، سماجی برتاؤں اور معاشی، معاشرتی میں تغیر واضح کرتے ہیں یہاں تک کہ دو مختلف ادوار اور دو مختلف علاقوں کے رہنے والے لباس تک میں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور لباس کا یہ اختلاف صرف ظاہری حد تک لباس کا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ دو تہذیبوں کی سماجی اقدار میں علامتی حد فاصل بھی ہوتا ہے۔

ناول زینو اور مندری والا میں کردار سیاسی نظام کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے حوالے سے بحث کرتے ہیں۔ ایک معاشرہ انسانی زندگی کے گرد گھومتا ہے۔ انسانی زندگی ایک وسیع موضوع ہے جس پر بحث کی جاتی ہے۔ سیاسیات کا تعلق باقی علوم معاشیات، اخلاقیات، نفسیات اور تاریخ اور دیگر علوم سے ہمیشہ رہتا ہے۔ انھی علوم سے معاشرہ بنتا ہے۔ معاشرتی زندگی سے متعلق سیاسی نظام کو متحرک رکھنا پڑتا ہے۔ یونان کے فلاسفہ کی طرح دوسرے ممالک سے تعلق رکھنے والے فلاسفہ نے بھی سیاسیات کا تعلق دوسرے علوم سے جوڑا ہے۔

سیاسیات میں فلسفے یعنی غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس سے ایک ریاست وجود میں آتی ہے۔ ریاست سیاسی نظام کو چلاتی ہے۔ فلاسفر کے نزدیک ریاست کا مفہوم مختلف ہوتا ہے ریاست وقت کے ساتھ ساتھ اپنے اندر تبدیلی رکھتی ہے۔ دورِ جدید میں اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ تہذیب میں مختلف مذاہب کے پیروکار ہوتے ہیں۔ جن کی وجہ سے مختلف لوگ آکر بستے ہیں۔ معاشرے اور ریاست میں فرق ہے معاشرہ ایک جماعت کی صورت سامنے آتا ہے جو کہ غیر منظم ہے جیسا کہ خانہ بدوش لوگوں کا رہن سہن ان کے طور اطوار بول چال، سوچ و فکر وغیرہ جب کہ ریاست میں رہنے والا ایک منظم طریقے سے رہتا ہے یعنی ریاست کو ایک حکومت چلاتی ہے جس میں ایک سیاسی نظام لایا جاتا ہے۔ ایک خاص سوچ اور فکر رکھنے والا حکومتی سربراہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارسطو نے کہا کہ بادشاہ کو بھی حکومت چلانے کے لیے فلسفی کی طرح سوچنا ہو گا۔ فلسفے کے علم کی بنیاد پر اسے آگے بڑھنا پڑے گا۔ حکومت نے ریاست کے اندر فنون و علوم کا خاص خیال رکھنا ہوتا ہے کیونکہ مختلف علوم سے انسانی زندگی کو سمجھا جا سکتا ہے۔ انسان اور جانور میں فرق علم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ضروریاتِ زندگی، سیاسی نظام میں فن کا استعمال، علوم و فنون کا جاننا اور بود و باش، رہن سہن، طور اطوار سے معاشرہ مستحکم ہو کر ریاست کی شکل اختیار کرتا ہے۔

ناول مندری والا ور زینو کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اقتصادیات میں انسان کے اُن ارادی کاموں کو دیکھا جاتا ہے جن کا ربط روزمرہ زندگی کے محرکات سے ہے۔ اقتصادیات بھی ایک علم ہے۔ انسان انفرادی اور اجتماعی حوالے سے اس کا حصہ بنتا ہے اور اس سے تعلق خوشحال زندگی کے لیے کوششوں کا نام ہے۔ معاشیات معاشرے میں دولت کا علم ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کا اہم پہلو بھی ہے۔ معاشیات کا تعلق دراصل معاشرتی زندگی سے ہے۔ آمدنی بڑھانے اور ملک کی بے روزگاری کم کرنے کے لیے معاشیات کس طرح استعمال میں لائی جاتی ہے یہ حکومت کے ذمہ ہوتا ہے۔

ایک طرف سرمایہ داری کا دور ہے اور دوسری طرف کمیونزم اور سوشلزم کی یلغار جاری ہے۔ تیسری جانب دنیا میں مختلف ممالک ترقی پذیر اور کچھ پسماندہ ممالک سامنے آرہے ہیں۔ اقتصادی ذرائع کی اگر ملک میں مضبوط نہیں ہو گی تو وہ ملک کبھی بھی دنیا میں اپنا مقام حاصل نہیں کر سکتا یعنی دنیا میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اقتصادی طور پر مضبوطی معاشرے خوشحالی کی ضمانت ہے۔ اگر کسی بھی ملک کا اقتصادی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہے گا تو پسماندگی اُس ملک کا مقدر بن جاتا ہے۔

جیسے کسی بھی فیکٹری یا کارخانے میں باقاعدہ دفتری کام بھی ہوتا ہے یعنی کام کرنے والوں کا مکمل ڈیٹا بھی رکھا جاتا ہے۔ اس کے لیے بھی مختلف لوگ تعینات کیے جاتے ہیں۔ کام کرنے والوں کے لیے تنخواہ بنانے والے علیٰحدہ ہوتے ہیں اور باقی چیزوں کا حساب کتاب رکھنے والے الگ لوگ ہوتے ہیں۔ اور ایک منظم طریقے سے کارخانہ چلایا جاتا ہے۔ ناول نگار نے اس حوالے سے ناولوں میں منفرد تصویر کھینچی ہے۔

پرانی تہذیبوں کے بہت بڑے بڑے محلات اور حویلیاں آج بھی کہیں کہیں موجود ہیں۔ لوگوں نے نئ حویلیاں پرانی طرز سے بھی بنا رکھی ہیں۔ اور کچھ علاقوں میں پرانی حویلیاں اور بڑے بڑے گھر خالی پڑے ہوئے ہیں۔ جنھیں لوگ آباد کرنے سے ڈرتے ہیں کیونکہ آسیب کے حوالے سے مشہور ہوتے ہیں۔ اس لیے وہاں لوگ نہیں رہتے۔ لیکن زیادہ تر لوگوں نے پرانی تہذیبوں کو آج بھی آباد کیا ہوا ہے۔ ناول نگار نے اس ناول 'مندری والا' میں تہذیبی تنوع کو بہت اجاگر کیا ہوا ہے۔ جسے کہ اس ناول کا ہیرو جمال جب ایک کالی پہاڑی پر پہنچتا ہے۔ اور وہاں سارے گھر میں گھومتا ہے۔ وہ گھر کیا ایک حویلی ہوتی ہے۔

سماجی زندگی کے اہم جزو اگر منتشر ہو جائیں گے تو یقیناً ہمارا پورا سماج انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ آزاد ملک میں آزادی رائے سے ایک منظم اور مستقل اصولوں کے تحت مناسب سماجی ماحول بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ مختلف منفی رجحانات کے عمل وردِ عمل میں ایک متوازن اور اہم آہنگ معاشرے کی بنیاد رکھی جاسکے جس سے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور اخلاقی قدریں ایک متنوع اور رنگارنگ زندگی بنانے میں اہم کردار ادا کریں۔

دونوں ناول اس بات کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں کہ دُنیا میں مختلف ممالک کے دشمن عناصر لوگ بچوں کی خودکش حملوں کے لیے تیار کرتے ہیں۔ خودکش حملوں آوروں کو پاکستان کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک میں کارروائیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ خودکش حملوں کی تربیت بچوں کو چھوٹی سی عمر میں انسانی دشمن لوگ دیتے ہیں۔ اور مذہب کی آڑ میں بھی بچوں کو استعمال میں لاتے ہیں۔ انھیں جنت کے حوالے سے لیکچر دیا جاتا

ہے کہ اور جنت کے منظر کو بیان کیا جاتا ہے اور ان کم عمروں بچوں کے ذہنی طاقت کو اپنے قابو میں کر کے انھیں استعمال کر لیا جاتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا شک نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے پیچھے اگر مذہبی لوگوں کا ہاتھ ہے تو وہ لوگ نام کے مذہبی ہوتے ہیں۔ وہ کسی حوالے سے اللہ اور اس کے رسول کے چاہنے والے نہیں ہوتے۔ کیونکہ اسلام واحد ایک ایسا مذہب ہے جو انسانیت بڑا علمبر دار ہے۔

ناول مندری والا میں کالی پہاڑی ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر تخریب کاری کا سامان تیار کیا جاتا ہے۔ وہاں کے لوگ شہر کے کیوں دشمن ہیں؟ وہ شہر کو کیوں بدبودار کہتے ہیں۔ یہ لوگ پہلے اسی شہر کے باسی تھے پھر یہاں کی ریاستی حکمران سے تنگ آکر پہاڑوں میں آچھپے ہیں اور یہاں سے جمال کو ایک میگزین پڑھتے ہوئے معلوم ہوا کہ میں یہاں رہ کر آیا ہوں۔ جمال بہت پریشان تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ پریشانی اس وجہ سے بڑھ گئی کہ میگزین میں کالی پہاڑی پر مضمون لکھنے والا شخص ایک تفتیشی صحافت میں مہارت رکھتا تھا۔

کسی بھی ملک کے عوام ملکی مسائل اور ترقی پر اپنی رائے دیتے ہیں اور اپنے تجزیوں اور مشاہدوں سے ملک کی سماجی، سیاسی اور معاشی حالات سے پیدا ہونے والی مشکلات کو بیان کرتے ہیں۔ اپنی عملی اور تحقیقی صلاحتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بین الاقوامی ممالک کو موردالزام ٹھہرا کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں اور اپنے ایک امید کی مسکراہٹ بھی ساتھ لے جاتے ہیں جس میں کل کی کوئی اچھی خبر پوشید ہوتی ہے۔ لیکن صورتِ حال کے مطابق سیاسی نظام ایک منظم نظام بنانے میں ناکام ہے۔ ایک طرف امیر طبقہ سر اٹھائے پھر رہا ہے اور دوسری طرف چھوٹا طبقے کے غریب لوگ اپنی زندگی کو گھسیٹ کر صبح سے شام تک لے جاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ جو بات ہر طبقے کے لیے خوف ذدہ ہوتی ہے وہ دہشت گردی ہے۔ جس کی لپیٹ میں اس وقت پوری دنیا ہے۔ ایک طرف سے آواز آتی ہے کہ تبدیلی آکے رہے گی اور دوسری طرف سے آواز اس کے برعکس ہوتی ہے کہ تبدیلی تم کیا لاؤ گے تم میں اتنا دم نہیں ہے کہ کچھ دن حکومت کو چلا سکو۔ اس طرح کی صورتِ حال سے تخریب کار لوگوں کو موقع ملتا ہے اور کارروائی کرنے میں وقت نہیں لگاتے۔ معاشرے کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

دورِ حاضر میں اردو ناول کے موضوعات میں بہت وسعت سامنے آئی ہے۔ بدعنوانی ریاستی یلغار، گلوبلائزیشن، دہشت گردی، اخلاقیات، عورت کا مقام، سیاسی انتشار، لاقانیت، اقتصادی حالات، تہذیبی شکست، طبقاتی کشمکش، بدامنی اور فرقہ واردیت جیسے مسائل جدید دور میں ناول نے موضوعات کے طور پر لیے

ہیں۔ناول کا تعلق ہر دور کے معاشرے سے ہے۔ یہ انسانی زندگی کے نظام سے متعلق تمام پہلو کا اظہار کرتا ہے۔ جدید دور میں بھی تہذیبی ثقافتی حوالے کا ترجمان ہے۔اس لیے اسے دورِ حاضر کا رزمیہ بھی کہتے ہیں۔

ناول مندری والا میں مرکزی کردار جمال کالی پہاڑی سے جب واپس اپنی دُنیا میں لوٹ کر آتا ہے تو ایک مصلح کے روپ میں نظر آتا ہے۔پہلی دنیا میں آ کر بھی دوسری دنیا سے اس کردار کا تعلق مشکوک ٹھیرتا ہے۔ناول زینو میں زینو میں مکانی حوالے سے دیکھیں تو شہر ایتھیز اور تھیبیس، ریاست ایلس اور شہر اولپیا، سپارٹا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جبکہ ناول مندری والا میں مکانی حوالے سے صرف شہر کا ذکر اور اس کے ساتھ کالی پہاڑی کا ذکر کیا گیا ہے۔

اسی طرح اگر زمانی حوالے سے دیکھیں تو ناول زینو میں ہمیں زینو کردار جس طرح دور قدیم میں متحرک نظر آتا ہے ا۔ناول نگار نے زینو کو دورِ معاصر میں دوبارہ زندہ کیا اور اس کے کردار کو متحرک دکھایا ہے۔زمانی اعتبار سے مندری والا ناول میں کالی پہاڑی پہ وقت کو رکا ہوا دکھایا گیا ہے۔کالی پہاڑی پر جہاں مندری والا کردار کی حویلی ہوتی ہے۔ وہاں ہمیشہ وقت گیارہ بج کر سات منٹ ہی رہتے ہیں۔

وحید احمد کے ناولوں میں تہذیبی عناصر سے متعلق آنے والے مباحث، کرداروں، منظر نگاری اور ان کے متعلق وحید احمد کے نقطۂ نظر ملتا ہے۔اس سلسلے میں وحید احمد کے ناول سے متعلق فن اور فکر کو واضح کیا گیا ہے اور جہاں جہاں اس حوالے سے اُن کی فکر میں نظریاتی اعتبار سے تنوع اور ارتقا سامنے آیا ہے وہاں اُن کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ناول نگار کے دونوں ناولوں میں ایک معنوی ربط ملتا ہے۔

ب: نتائج:

وحید احمد کی ناول نگاری میں تہذیبی عناصر کا تجزیاتی مطالعے سے جو نتائج سامنے آئے ہیں۔ درج ذیل ہیں:

ا۔ انسان کی پیدائش، اس کے زندگی کے مسائل اور کائنات کے بارے میں غور و فکر اور حیات مابعد الممات کے بارے میں سوچ بچار کرنا قدیم دور سے فلسفے کے بنیادی مباحث میں شامل رہا ہے۔ قدیم فلسفے اور خاص طور پر یونانی فلسفے میں ان مسائل کو عموماً جدلیاتی انداز میں پیش کیا جاتا تھا اور منطقی انداز میں دلائل کی پیش کش کی جاتی تھی۔ قدیم طریقۂ علم میں تہذیبی عناصر کا اظہار عمومی طور پر مفروضاتی تھا۔ جب کہ انسان کے جملہ سروکاروں کے بارے میں جدید فلسفیانہ دانش ورانہ، تنقیدی و فکری مباحث کا دائرہ کار تجربیت اور وجودیت سے متشکل ہوتا ہے۔

۲۔ وحید احمد کے ناول زینو میں موجود تہذیبی عناصر میں سماجی اقدار، سیاسی نظام، اقتصادی ذرائع، علوم و فنون، ماحولیات، سائنس، جدید، قدیم فلسفیانہ مباحث کی فن کارانہ پیش کش ہے ایک متنوع ناول کا بیانیہ ہمارے سامنے آتا ہے۔

۳۔ وحید احمد کے ناول مندری والا میں جدید دور کے ہمہ جہت اور لامتناہی مسائل کے بارے میں جدلیاتی انداز میں کرداروں اور واقعات کی پیش کش کی گئی ہے جس سے بہت سے جدید و قدیم انسانی مسائل کی تحلیل ہوتی ہے اور قاری پر فکر کے نئے در وا ہوتے ہیں۔

ج: سفارشات:

۱۔ وحید احمد کے ناولوں پر تہذیبی حوالے سے علاوہ ان کے ناولوں کے کرداروں پہ بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ ناول زینو اور ناول مندری والا کے فنی، اسلوبی اور تکنیکی حوالے سے جائزہ لینے کے لیے تحقیق کی ضرورت ہے۔

۳۔ وحید احمد کے ناول زینو کا معاصر ناول نگاروں کے ناولوں کے ساتھ تقابلی مطالعہ ضروری ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ:۔

۱۔ وحید احمد، مندری والا، مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار فیصل آباد، ۲۰۰۷ء

۲۔ وحید احمد، زینو، مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار فیصل آباد، ۲۰۰۷ء

ثانوی ماخذات:۔

۱۔ عبد اللہ حسین، اداس نسلیں، سنگِ میل پبلیکشرز لاہور، ۲۰۰۴ء

۲۔ صالحہ زریں، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، سر سوتی پریس الہٰ آباد، ۲۰۰۰ء

۳۔ کرسٹین پرائیس، ہلال احمد زبیری، مترجم، اسلامی فنون کی داستان، شیخ غلام علی سنز لاہور، ۱۹۶۸ء

۴۔ ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقا، (مترجم) تنویر جہاں، فکشن ہاوس 18-مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۰۴ء

۵۔ آر۔کے۔جی، مترجم، اقتصادی ترقی کی کنجی، حالی پبلیشنگ ہاوس دہلی، س۔ن

۶۔ جمیل جالبی، پاکستان معاشرہ اور ادب (ادب کا سماجی پہلو) مرتبین، سید حسین جعفری، سلیم احمد، پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی، ۱۹۸۷ء

۷۔ سبطِ حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، مکتبہ دانیال کراچی ۲۰۱۷ء

۸۔ شبلی صاحب مولانا، مترجم، تاریخ تہذیب و تمدن، بک ٹائم کراچی، ۲۰۱۳ء

۹۔ علی عباس جلالپوری، تاریخ کا نیا موڑ، تخلیقات لاہور، ۲۰۱۰ء

۱۰۔ عبد المحصی، مترجم، تعارف جدید سیاسی نظریہ، مجلسِ ترجمہ کارواں پریس ایبک روڈ انارکلی لاہور، س۔ن

۱۱۔ علی عباس جلالپوری، روایاتِ فلسفہ، تخلیقات لاہور، ۲۰۱۰ء

۱۲۔ محمد طاہر القادری، ڈاکٹر، سیرۃ الرسول ﷺ کی تہذیبی و ثقافتی اہمیت، منہاج القرآن پرنٹرز لاہور، ۲۰۰۷ء

۱۳۔ ظہیر احمد صدیقی، فکری زاویے، نئی دہلی قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۰ء

۱۴۔ عابد حسین، سید، قومی تہذیب کا مسئلہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۱۹۹۸ء

۱۵۔ عبید الرحمن، ڈاکٹر، کچھ سائنس سے، لبرٹی پریس دریا گنج دہلی، ۲۰۰۳ء

۱۶۔ ظ انصاری، کمیونسٹ اور مذہب، مکتبہ شاہراہ دہلی، ۱۹۸۵ء

۱۷۔ ولی اللہ خاں، گندھارا، لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد، س۔ن

۱۸۔ شفق سوپوری،ڈاکٹر، مخزنِ موسیقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۱۲ء

۱۹۔ جمال پانی پتی (مرتب)، مضامینِ سلیم احمد، اکادمی بازیافت لاہور، ۲۰۰۹ء

۲۰۔ نگار سجاد ظہیر، ڈاکٹر، مطالعہ تہذیب، قرطاس گلستان جوہر بلاک 15 کراچی، ۲۰۰۰ء

۲۱۔ وارث علوی، منتخب مضامین، فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ کراچی، ۲۰۰۰ء

۲۲۔ سید قاسم محمود مرحوم، مترجم، نقوشِ ثقافت، مقتدر قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

۲۳۔ حسن دین احمد، ہندوستان کا معاشرتی نظام، ادارہ معاشیات فاطمہ منزل حمایت نگر دکن حیدر آباد، س۔ن

۲۴۔ حبیب حق، یونانی تہذیب کی داستان، نگارشات پبلشرز، 24۔ مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۱۵ء

انٹرنیٹ

۱۔ ریحان عزیز، معاشرہ اور سرمایہ داری www.rejectingfreedomandprogress.com ، ۴ فروری ۲۰۱۹ء، 09:29am